

میں آواں گی ہوائن کے

مصنفہ
زاہدہ پروین



اور جب کسی موضوع پر قلم اٹھ جاتا ہے تو پھر ادب، دل، دماغ بھی سچو ہوش نہیں رہتا۔ سو آج کل بھی ایک نئی تخلیق کے مراحل طے کرتے ہوئے قارئین کی پسند ناپسند کو مد نظر رکھنا پڑ رہا ہے۔ مصروفیت کے باوجود یہ پیش نکتہ لکھ تو دیا ہے مگر آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

اپنا لکھنا لکھنا تو سرست میں سرائت کر چکا ہے جس سے ویچھا چھڑاتا تا ممکن ہے۔

الھیوں	کو	تراش	دوں	پھر	بھی
عادت	اس	کا	نام	لکھیں	گی
کمزکیوں	پ	دیر	پردے	ہوں	
بارشیں	پھر	دستک	دیں	گی	

زاہدہ پ ۲۰۲۰

مُو ہے باریاں تے نال کنداں آپ کے
آواں کی حوائن کے

مُو ہے باریاں تے نال کنداں آپ کے

گانے کے اتنے خوب صورت بول ہوں آواز سے سوز و گداز شہد بن بن کے
ٹپک رہا ہوا اور ہر آن بڑھتی شام کے سائے ہوں تو پھر بھلا کس کا فر کا جی نہ چاہے گا کہ
ہمد تن گوش ہو کر سنتا ہی رہے بس یہی حال اس وقت رانی کا بھی تھا۔

مگر ساتھ ہی اُسے زیر دست کوفت کا احساس بھی ہو رہا تھا کیوں کہ شہر کی طرف
عازم سفر جس بس میں اس وقت یہ گیت ہمد تن گوش کیفیت میں سن رہی تھی مناسب
رفتار سے چلنے کے باوجود انجن کے شور اور کھمبیر مائیر نے سارا مزہ کر کر کر رکھا تھا اور وہ
کئی مرتبہ پہلو بدل بدل کر اس شور کو کوس پکی تھی۔

تجبی 'آنہوئی' ہونی میں تبدیل ہو گئی اور بس ایک زور دار دھماکے کے ساتھ
لنگڑاتی ہوئی اچانک تھم گئی۔ رانی قدرت کی فیاضی پر عیش کر اٹھی۔ اگر اس وقت
خدا سے کچھ اور بھی مانگتی تو شاید مل جاتا!

اب صورت حال یہ تھی کہ بس کا پچھلا ٹائر پچھڑ ہو چکا تھا اور وہ حرے سے ٹانگ

آواں کی حواہن کے O..... 8

پرٹنگ رکھ کر آنکھیں موندے گیت کا اگلا حصہ سن رہی تھی۔

دلاں دیاں رہاں تے پیرے عیوں نگدے

مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ عیوں سکدے

مینوربت نے بنایا تیرے لئی اوئے

متھے تیراں لکھ کے

نہ ہے باریاں تے نال کنڈاں پ کے

میں آواں کی حواہن کے

نہ ہے باریاں

آواز کے حسن اور شاعری کے سحر نے رانی کو مست و بے خور کر دیا۔ اچھی موسیقی اس کی یوں بھی کم زوری تھی اور ان لحاظ میں وہ اس لیے بھی خالی الذہن سی ہو رہی تھی کہ تمام دن پڑھانے اور ڈیوٹی دینے کے بعد مختصر سے سفر کے یہ لحاظ اسے روزی بہت اچھے لگتے تھے۔ اپنا آپ بہت ہلکا بھلکا اور پرسکون سامعوس ہوتا اس لیے وہ بس پڑنے والی افتاد سے بے خبر بڑی توجہ اور یک سوئی سے سن رہی تھی۔ بس میں فٹ کبیسٹ پلیئر برابر آن تھا۔

جنن جہدوں چڑھیا تے لوکی پے بکدے

ڈوٹے پانڑیاں دے دھج دیوے پے بلدے

کندے لگ جہاواں کچا گھڑاں کے

میں آواں کی حواہن کے

نہ ہے باریاں تے

لیکن اس کے پسندیدہ لحاظ زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکے اور اس سے قبل کہ وہ مزید لطف اندوز ہو سکتی کسی نے اسے شانے سے پکار کر ہلا دیا۔

آواں کی حواہن کے O..... 9

اس نے سیدھی ہو کر دیکھا۔

برادر والی پورھی عورت گھبرا گھبرا کر کہہ رہی تھی۔ ”سنا تو نے لڑکی! بس کا پیہ پھٹ گیا ہے۔“

”تو کیا ہو گیا! دوسرا لگ جائے گا۔“ رانی نے ناگواری سے جواب دیا۔

”مصیبت تو یہی ہے کہ ان کے پاس پیہ ہے ہی نہیں۔“

اب رانی کے لیے اس مداخلت بے جا کو برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ بہت بے زاری اور بدتمیزی سے بولی۔ ”وہ کسی دوسری بس سے لے سکتے ہیں۔ تم میرے کان مت کھاؤ۔“

مگر بڑی بی بھی نہایت ڈھیٹ واقعی ہوئی تھیں کڑک کر بولیں۔ ”آئیے تو تیری آنکھیں کیا پھوٹی ہوئی ہیں! دیکھ نہیں رہی دو بیسز کے بغیر کچے پرائر کے جا چکی ہیں۔ کسی نے بھی پیہ نہیں دیا۔ ڈلیور (ڈرائیور) ہے چاراپلا تارہ گیا۔ لوجی بھائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ میں تو کہہ رہی تھی یوں ہی شام پڑ جائے گی۔ کہاں جائے گی اکیلی پر یہ تو اپنے آگے کسی کو جانے ہی ناں وا دیتی خوب رہی۔“ وہ خوب بڑبڑاتی اپنی گھڑیاں لے کر نیچے اتر گئی۔

اب رانی کے بھی ہوش ٹھکانے آئے۔ بڑی بی کی بڑا بڑا ہٹ کیا رات پڑے اس جنگل بیابان میں بس والوں کے ساتھ رہے گی؟ اس کا دل دھج چیر گئی تھی۔

ارد گرد کے ماحول پر غور کیا تو اس کی آنکھیں کل گئیں۔ چند ایک زنانہ سوار یوں کے علاوہ سب بس سے اتر کر ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ محلے کے لوگ پریشانی کے عالم میں لوگوں کو تسلیاں دیتے پھر رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیتوں میں شام کی ہوا سرسراہٹیں پیدا کر رہی تھی۔ تیار کھڑی فصلوں کے پودے بھی لہلہا رہے

اب وہ بھڑک کر بولی۔ ”واہ جی! اس ”اتفاق“ کی بھی خوب رہی۔ لاکھوں کی بس تو خرید سکتے ہیں مگر قاتلوں کا نہیں رکھ سکتے آپ لوگوں کو مسافروں کی سہولت کا ذرہ برابر خیال نہیں۔“

”جی..... اب ہم کیا کر سکتے ہیں! بس اللہ کی مرضی۔“ کنڈیکٹر پوری ڈھٹائی سے اپنا دفاع کیے جا رہا تھا۔

”اچھی بات ہے۔“ وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ”اب آپ ایسا کریں کہ مسافروں کا کرایہ واپس کر دیں شرافت سے۔“

ادھر ادھر ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے مسافر یہ حکم اور بحث سن کر کنڈیکٹر کے ارد گرد جمع ہونے لگے تھے۔ اس کا تو دم نکل گیا۔ ساری اکڑفوں بھول کر ہلکاتا ہوا بولا۔ ”یہ..... کیا کہہ رہی ہیں آپ..... کمال کرتی ہیں آپ تو..... صرف نو میل تو شہرہ کیا ہے یہاں سے.....“

”واہ واہ..... آپ تو کسی ٹونے مرے فقیر کو بھی ایک روپیہ نہیں چھوڑتے۔“ وہ مزید چمک کر بولی۔ ”اور اب نو میل کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔“ پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر بڑی دھول سے بولی۔ ”براہ کرم آپ ان سب کا کرایہ واپس کریں..... اگر آپ لوگوں سے قبائل سواروں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔“

مسافروں کو تو فوراً سے پیش تر ہی یہ شورہ پسند آ گیا۔ چاروں طرف سے ہانکیں لگنے لگیں۔ بھلا ایسی تنگی کون دو کر سکتا ہے! جلد ہی بس کے عملے نے اکثریت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور مسافروں سے اپنا حساب کتاب چکا کر جان چھڑائی۔

جھلاہٹ ہی جھلاہٹ میں یہ تمام کارروائی تو رانی نے کر ڈالی تھی مگر اصل مسئلہ جوں کا توں موجود رہا۔ چور کو چور کے گھر پہنچا دینا اس کی عادت میں شامل تھا اس سلسلے میں بعض اوقات خود اپنا نقصان بھی کر بیٹھی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی کنڈیکٹر سے

تھے جن کے سچ جتنی پگھڑی پر دو ساڑتی سوار گرد کے گجے لے اڑاتے چلے جا رہے تھے۔ سروس کے چٹکے ہوئے پیلے پیلے بھولوں پر شام کا سرخی آٹھل پھیلنا لہراتا کرتا چلا آ رہا تھا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے لمبی لمبی چیزیں اور گھاگھرے والی عورتوں نے روتے ہوئے بچوں کو گودوں میں بھرنا مردوں نے میلی کچلی گھڑیاں شانوں پر ڈالیں اور لمبے لمبے ڈنگ بھرتے پیدل ہی سڑک پر ہو لیے۔ رانی کے ساتھ جھڑپ لینے والی بڑی بی بھی ان کی ہم سفر تھیں۔ اُس نے کھائی کی گھڑی پر نظر ڈالی وقت کا اندازہ ہوتے ہی اُسے شدید بھوک کا احساس ہوا ساتھ ہی اماں بی کا بے قرار وجود اور شرمین کی خستہ نگاہیں بھی ہولانے لگیں۔ آج ویسے ہی کالج میں تین بج گئے تھے اور اُس کی ہر روز والی بس چھوٹ گئی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اماں بی کی زیادہ فکر تھی کیونکہ وہ اختلاج قلب کی مریض تھیں۔ شرمین بھی اب تک اُس کے انتظار میں بھوکے بیٹھی ہوئی۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا۔ جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کی یہ ہر دم دھلتی شام اس کے لیے عذاب ہو گئی۔ اُس نے کھڑکی کا شیشہ پٹا کر کنڈیکٹر کو بلایا اور غصائی پر اُتار ڈالا۔

”کیا بات ہے؟ بس کیوں روک رکھی ہے؟“ اُس نے انجمن بن کر پوچھا۔

”آپ دیکھ نہیں رہیں! پچھلا جائز چکر ہو چکا ہے۔“ کنڈیکٹر نے ترکی پر ترکی جواب دیا۔

”تو..... کیا آپ کے ملک کے گورنر نے نہیں آجائے؟“ اُس نے اپنا انداز بدلا۔

”جی نہیں بلکہ اتنا قاتل دوسرا گناہ نہیں ہے ہمارے پاس۔“ کنڈیکٹر نے پھر اسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔

کرائے کی بسوں کو ترجیح دینے والی کے لیے یہ قطعی پہلا چانس تھا جب کہ دل ہی دل میں وہ اس صورت حال سے سخت ہراساں اور خوف زدہ تھی اور شاید یہ اسی بدحواسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے لفٹ کے لیے ہاتھ بھی دیا تو مخالف سمت سے آنے والی گاڑی کو۔
 ”فرمائیے؟“ لمبی سی خوب صورت گاڑی کے اسٹیرنگ کو تھامے ایک بے حد زیب دار اور یادگار شخصیت نے سر باہر نکال کر بڑی شائستگی سے دریافت کیا۔

وہ جھپٹ کر نزدیک پہنچی اور جلدی جلدی تیز لہجے میں اپنی چٹانے لگی۔
 ”اکیسے پلیز! بالکل شام ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ بس کا ایک چار چنگر ہو گیا ہے دو گھنٹے ہو گئے دوسری سواری بھی نہیں مل رہی۔۔۔۔۔ بہت ڈر لگ۔۔۔۔۔ رانی نے کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”او۔۔۔۔۔ آئی سی۔۔۔۔۔“

انہوں نے ڈویتی شام میں بے کار کھڑی بس اور پھر رانی کے ہلکے پھلکے وجود کو نہ تشویش نظروں سے دیکھا۔ پھر پلٹ کر کار کی کچھلی سیٹ کو دیکھنے لگے۔
 اُن کا متذنب جلد ہی رانی کی سمجھ میں آ گیا۔

کچھلی سیٹ پر بہت سے سامان سے بھرے ہوئے پکٹ بے ترتیب حالت میں بکھرے ہوئے تھے۔ غالباً رکھنے والے نے اکیلا ہونے کی وجہ سے یا پھر لا پرواہی سے گاڑی کی ڈکی استعمال ہی نہ کی تھی۔

رانی کو اس صورت حال پر کیا اعتراض ہوتا تھا؟ جنگل میں کڑھتے رہنے سے تو یہ کہیں غنیمت تھا۔ وہ تقریباً بھاگتے قدموں سے گھوم کر دوسری طرف آئی اور غلجٹ میں فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔ مبادا وہ چھوڑ نہ جائیں!

صاحب کار نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی اشارت کی ایک چھوٹا سا موڑ کاٹ کر اس کا رخ دوبارہ شہر کی طرف کر دیا۔ گاڑی کا رخ تبدیل ہوتے ہی رانی کو

جھڑپ لینے کے بعد وہ پہلے کی نسبت زیادہ غیر محفوظ ہو گئی۔ بس کا ٹکڑا سے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ صوبے کا اندرونی علاقہ ہونے کی وجہ سے ان اطراف میں کسی رکشہ، ٹیکسی کے ملنے کا امکان ہی نہ تھا۔ بس کے چیمبر بھی زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ اور دیہاتی قسم کے تھے۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے شہر جانے والے ایک ٹرک کو روک کر کچھ لوگ اس میں بھر کے چلے گئے اور بس کے محلے کے علاوہ چند افراد ہی باقی رہ گئے یا پھر یکے بعد دیگرے خود تھی۔

اور اب بس کی سیٹ پر کہاں تک جمی رہتی طوعاً و کرہاً نیچے اتر آئی اور دل مضبوطا کر کے حالات کا جائزہ لینے لگی۔

شام کا چھپتا ہر طرف پھیل گیا تھا۔

سڑک کی دوسری طرف جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ پردوں کے جھرمٹ بھرا مار کے جھاڑیوں سے نکلے اور نہ معلوم سمتوں کو اُڑ جاتے۔ کووں کے غول غول کانٹیں کانٹیں کرتے شور مچاتے اپنے بسروں کی طرف ٹھو پرواز تھے۔ رانی کے آس پاس چند کھانسنے کھکھراتے مردوں کے علاوہ کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا۔ شہر یہاں سے بہت دور تھا۔ پوری قوت سے بھی بھاگتی تو بھی نہ پہنچ پاتی۔ اُس نے دوبارہ قاعدے سے شانوں پر پھیلا یا۔ چشمہ اتار کر پرس میں رکھا اور قدم بٹھا کر رکھتی ہوئی سرس کے درختوں کے اس ٹھنڈے کی طرف چل دی جن میں پیلے پیلے پھولوں کے کچے جھول رہے تھے۔ ان کی دل نواز مہک ہوا میں رہی ہوئی تھی۔ دور کھڑے کھڑے ٹیکروں کے پیچھے دھواں اٹھ رہا تھا اور دھندلے میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا جو اس امر کی علامت تھا کہ ضرور ریت کے بکھرے ہوئے ٹیلوں اور ٹیوں میں کہیں نہ کہیں انسانی آبادی موجود ہے۔ مگر رانی کو اُن سے کیا مدد مل سکتی تھی وہ تو درختوں کے نیچے اس امید میں آکھڑی ہوئی تھی کہ کسی سے لفٹ مانگ سکے۔ دوسروں کی چمپاتی گاڑیوں پر

”عائش لفت لیتے وقت عرض کر چکی ہوں کہ گزشتہ دو گھنٹے سے سواری نہیں مل رہی تھی۔ اب اگر آپ اپنی رستہ واپس پر نظر دوڑائیے تو آپ کو یقیناً اندازہ ہو جائے کہ اس وقت سے دو گھنٹے قبل بڑھتی شام کی بجائے دھلتی سہ پہر کا سماں تھا۔ ایسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس دیرانے سے میں تقریباً نہیں گزر رہی تھی بلکہ کالج سے آ رہی تھی۔“

”اوہ..... اچھا تو یہ بات ہے وہ اس کے عند لہجے کو نظر انداز کر کے بڑی آسودگی سے بولے۔ گویا مطمئن ہو گئے ہوں۔“

”نہیک۔۔۔ بالکل ٹھیک۔۔۔ اچھا کس ایئر میں پڑھتی ہیں؟“

”جی نہیں۔۔۔ بلکہ پڑھاتی ہوں۔“ رانی کا موڈ اب تک خراب تھا۔ دھتّا انہوں نے سامنے سڑک سے ہٹا کر اپنی بے حد ٹھوڑی آنکھیں اس پر گاڑ دیں اور تسخیرانہ انداز اور چہیتے لہجے میں بولے۔ ”میرا خیال ہے بی بی آپ کی اور میری عمر میں ذمہ کا فرق تو ضرور ہی ہوگا۔ کیا ایسے میں آپ کو مجھ سے غلط بیانی زیب دیتی ہے؟“

رانی کا غصہ نقطہ عروج پر پہنچ کر خود بہ خود دھیمہ سا پڑ گیا اور وہ جی ہی جی میں بڑی بے چارگی سے سوچنے لگی۔ ”یا اللہ لوگ صرف اپنے آپ کو ہی قابل کیوں سمجھتے ہیں! خود پسندی کی انتہا ہے یہ بھی بیکار ان صاحب سے لفت لی۔ مفرور..... بدتمیز..... خود پسند کہیں کے!! گاڑی نہ ہوئی تھی ایرو پلین ہو گیا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لارہے۔“

حریہ خاموشی انہیں اور زیادہ شہجے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ لہذا بڑے اعتماد سے سر اٹھا کر بولی۔ ”آپ سے جھوٹ بول کر مجھے کون سا انعام و اکرام مل جائے گا اور یہ کونسی ایسی اعزازی سروس ہے جس پر آپ کو غلط بیانی کا گمان گزر رہا ہے!“

اُن کے ہونٹوں پر بے ساختہ قسم کا ایک دل نواز سا جھم چٹک اٹھا اور وہ رانی کے پیرے کے تاثرات دیکھے بغیر کہنے لگے۔

اپنی زیادتی احساس ہو گیا وہ سن سی ہو گئی۔ کالو تو بدن میں اب نہیں۔ جھپکتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بہت زیادہ افسوس ہے جناب۔۔۔ کہ میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہو رہی ہے۔ آپ یقین کیجئے۔۔۔!“

”اوہ! کیپ سالیٹیٹ پلیز۔۔۔“ انہوں نے ایک ہاتھ کی انگلی اٹھا کر اسے خاموش کرادیا۔ ”مجھے رکی تکلفات سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ آپ پریشان تھیں میں نے بروقت آپ کا مسئلہ حل کر دیا۔ بس بات ختم۔ ڈائریکٹ اپنے گھر پہنچنے کا بجائے آپ کے ہاں جا رہا ہوں۔ یہ امر آپ کے لیے شرمندگی کا باعث ہونا چاہیے۔ میرے لیے زحمت کا۔“ انہوں نے بات کچھ اس انداز میں کی کہ رانی پُپ کی پُپ رہ گئی۔ اس کے پاس بولنے کو وہ بھی کیا کیا تھا مگر انہوں نے شاید ابھی اپنی بات پورے نہیں کی تھی۔ لمحہ بھر بعد ہی وہ پھر اپنی گلیسری آواز میں پوچھ رہے تھے۔

”ویسے بائی دی ڈے کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی شام گئے یہاں شہر سے باہر آپ کا کیا کام وہ بھی تنہا؟ گفتگو کے آغاز میں لہجے کی نرمی اور ملائمت اُسے مسکور کر چکی تھی مگر سوال کا اختتام ہوتے ہوتے انداز ٹھیکھا اور کنٹینا ہو گیا جیسے کوئی بزرگ کسی نادان بچے سے باز پرس کر رہا ہو۔“

اچانک رانی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بلاوجہ ہی اُس سے بدگمان ہو چکے ہوں بلا کسی جان پہچان یا دوستی کے۔ ممکن ہے وہ اسے کوئی غلط ناپ لڑکی سمجھ بیٹھے ہوں اور اس وقتی طور سے اتفاقیہ صورت حال کو سوچتی کبھی اسکیم یا بہانہ خیال کر رہے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے ذہن میں سرے سے ان سب خرافات کی گنجائش ہی نہ ہو! مگر اب اس کو کیا کیا جاتا کہ رانی نے یہ تمام باتیں ایک بل میں سوچ ڈالیں اور سوچتے ہی اس کی خود داری بے پناہ بھلاہٹ بن کر دماغ پر ٹھو کریں رسید کرنے لگی اور جب بولی تو اس کا لہجہ بڑا تلخ اور جلا بھٹا تھا۔

سری انداز سے پوچھا۔

رانی نے چوہنگم چباتے چباتے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "پریم گڑھ کا ایک کالج ہے جو ناب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی ذاتی جائیداد کا ایک حصہ ہے اسی حصے میں مانڈانی رہائش گاہ "قصر دیدار" بھی واقع ہے۔ انہی کی ہمشیرہ زریب النساء نے یہ کالج قائم کیا ہے بلکہ خود پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔"

"بہت خوب، بہت بہت خوب....." وہ زریب مسکرا کر پھر گویا ہوئے۔ "مجھے تو یقین ہو رہی ہے بھلا ان کو سروس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

معاصرانی کو محسوس ہوا ان کا لہجہ مصنوعی سا ہے۔ جانے کیوں اتنا ہم بے حد قہر اور جیسے لہجہ میں بولی۔ "معاف کیجئے گا آپ کے خیالات بچکانہ سے ہیں۔ میرے خیال میں تو سروس ہمیشہ مالی مسائل حل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوا کرتی بلکہ اکثر اوقات دیگر انسانی خواہشات کی تکمیل بھی کرتی ہے۔ ہماری پرنسپل صاحبہ کا کہنا ہے کہ وہ بچپن ہی سے دوس و تدریس کی شائق رہی ہیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے خطیر اخراجات کے ساتھ یہ کالج قائم کیا ہے اور اس طرح خود اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل بھی کی ہے۔"

"آپ بھی غالباً شوقیہ ہی!" انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی نہیں!" اس نے گردن جھٹک کر جواب دیا۔ "میری سروس شوقیہ نہیں بلکہ ایک مجبوری ہے۔"

انہوں نے یقین آ جانے والے انداز میں اپنے خوب صورت بالوں والے سر کو جنبش دی اور کسی انجمانی سوچ میں کھو گئے۔

وہ خود یہ خود بہت سنجیدہ اور پُر پُرپ سے ہو گئے تھے۔

اب شہری آبادی کے آثار شروع ہو گئے تھے۔

کچھ آگے چل کر رانی نے دائیں طرف سے سیدھے راستے کی طرف اشارہ

"او..... آئی ایم سوری بس! آپ میری بات سے غلط اندازہ مت لگائیے دراصل آپ اتنی Young سی ہیں کہ میرے نزدیک تو ابھی..... اسٹوڈنٹ ہی ہوں گی۔"

اب رانی نے ایک طویل سانس کھینچی اور پرس سے چوہنگم نکالتے ہوئے لاپرواہی سے بولی "علم کی دنیا میں تو انسان ساری عمر اسٹوڈنٹ رہتا ہے لیکن جہاں تک میرے اسٹوڈنٹ ہونے کا سوال ہے تو جناب میری عمر کچھ کم بھی نہیں ہے بلکہ میں زریب النساء کالج برائے خواتین میں پچھرا ہوں اور میری اس سروس کو تیار وادہ کا عرصہ..... بعد کا فقرہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ گاڑی چلتے چلتے سڑک پر لہرائی گئی تھی۔ رانی کا سر پوری قوت سے ان کے شانے سے ٹکرایا۔ گھڑی بھر کسب گنڈ ہو گیا۔ گاڑی آ پھل کر کچے میں اتر گئی اور سامنے سے بھاری بھر کم ٹرک لڑکھڑاتا ہوا آئے بھونکے کی مانند پاس سے گزر گیا۔ حواس بحال ہوئے تو وہ سنبھل کر سمٹ کر بیٹھ رہی۔

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ سے ٹشواٹھا کر پیشانی پر پھینکتی پسینے کی بوندیں جذب کیں۔ خود بخود ہی ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر گاڑی اشارت کرتے ہوئے ٹشونگلی سے گویا ہوئے۔ "سوری..... ہاتھ ذرا بہک گیا تھا۔ ہاں..... تو آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ یہ زریب النساء کالج کدھر ہے بھلا؟"

رانی کو ان کے اچانک بدل جانے والے موڈ اور کرپہ نے کے انداز پر سخت کوفت ہوئی۔ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

"ہائے یہ بے چارے مردوں کو فطرت بھی کیا خوب ہوتی ہے! چاہے کیسی ہی اعلیٰ ذیلی سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں مگر اپنی فطری آنا کافی سے نہیں بچ سکتے۔ واہ مولہ! خوب فرصت میں تخلیق کی تو نے یہ مخلوق بھی۔"

"ہاں تو آپ نے بتایا نہیں؟" انہوں نے دغا اسکرین پر لٹکائیں جھانکے جھانکے

ان کو اماں بی سے متعارف کروا کے وہ سیدھی کچن میں جا گھسی۔ وہ مختصر وقت میں بہت کچھ کرنا چاہ رہی تھی۔

اور جب وہ پر تکلف چائے کے ساتھ لڑائی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ شرمین اور اماں بی سے یوں مکمل مل کر باتیں کر رہے تھے جیسے بہت ساری عزیز واریاں نکل آئی ہوں بیک وقت رانی کو مطلق نظر انداز کیے وہ اماں بی کو خوش کرتے رہے۔ اپنی خوش کامی خوش خلقی اور خوش گفتاری سے اور اماں بی! وہ تو ان سے اس قدر خوش اور متاثر ہو گئیں کہ وقت زخمت انہیں بار بار پھر آنے کی تاکید کرتی جا رہی تھیں۔

رانی کو ان کے رہنے پر حیرت تھی۔ اس کو اس طرح سے نظر انداز کیے ہوئے تھے جیسے وہ سرے سے موجود ہی نہ ہو! جب کہ شرمین اور اماں بی کو "اللہ حافظ" کہتے ہوئے ان کی نگاہ بہت بلندی پر یوگلیٹس کے پتوں میں الیکٹرک پول سے لپٹی دوھیا روشنیوں والی ٹیوب سے الجھی اور بغیر دیکھے ہی ان کی نظروں میں کریم نگر کے کرائے شلواریں لپٹا رانی کا وجود مسکور کن خواب کی مانند جل اٹھا اور وہ سیتے میں شور مچاتی بے شمار خوش گوار دھڑکنوں کو چھپائے گاڑی اشارت کرنے لگے۔



کیا۔ اسٹریٹ لائٹس جل اٹھی تھیں۔ مدھم مدھم آوازوں اور مسکراتی شام کے عکس میں وقت بے حد خوب صورت اور دل آواز ہو رہا تھا۔

"بس جتا! ادھر روک لیجے!" رانی نے اطمینان کا کھرا سانس لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ گاڑی بجری کی سرخ روش سے ہوتی ہوئی آہستگی سے رہائشی عمارت کے گول ستونوں والے خوب صورت برآمدے کے پاس قلم گئی۔ اونچے اونچے یوگلیٹس اور الماس کے درختوں سے گھرا ہوا یہ جدید طرز کا ایک چھوٹا سا خوش نما بنگلہ تھا جس کا مختصر سالان موسم بہار کے تازہ پھولوں سے مہک رہا تھا۔ خوش گوار جھونکے منہدی کم مدھم مدھم احساسات کو چھیڑنے والی متوالی خوشبو سے لدھے پھندے تھے جس کے تعاقب میں الماس کے پھولوں کی جی کو چھو لینے والی مہک بھی لپگی چلی آ رہی تھی۔ رانی کے اترتے ہی شرمین بے تحاشہ بھاگتی ہوئی اُس سے آ لپٹی۔

"اللہ آ پآ آج تو آپ نے ماری ڈالا اتنی دیر۔"

رانی نے عمارت سے اُس کی پیشانی دھو لی۔ پھر گاڑی کے اندر بھاگ کر شوخی سے بولی۔ "آپ رکی باتوں سے الگ ہیں اس لیے یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آئیے ایک کپ چائے پی کر جائیے مگر میری اتنی درخواست ضرور ہے کہ پلیز! اپنے پانچ منٹ حریہ ضائع کیجئے اور چل کر میری اماں بی کو تسلی دیجئے کہ آپ نے بروقت میری ہیلپ کی اور بخیریت پہنچا دیا۔"

خلاف اُمید وہ ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر دوسرا پٹ کھول کر باہر نکلے اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"کون ہیں یہ؟" شرمین نے اشارے سے دریافت کیا۔

"خاموش رہو!"

رانی نے ہونٹوں پر آنکلی رکھ دی۔

منتخب کی ہوئی کتابیں وہیں چھوڑیں اور تیز تیز قدموں سے پرنسپل آفس کی طرف چل دی۔

نواب زادی زیب النساء دیکھ کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ یہی اس کالج کی بانی اور پرنسپل تھیں۔ ادویہ عمر کی بہت باوقار اور حسین خند و خال والی خاتون شخصیت کا رکھ رکھاؤ اور سحر دیکھنے والی نگاہ از خود محسوس کرتی ہے۔ سرخ و سپید چہرے پر سنہری کمائیوں والی عینک شخصیت کی ہمہ گیری میں مزید اضافہ تھا۔
رانی کو سامنے دیکھ کر زرب لب مسکرائیں لیکن منہ سے کچھ کہے بغیر ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا کر باہر چلی گئیں۔

”ہیلو..... رانی اسپیکنگ!“ اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی صاحب زادی افروز جہاں کی چپکتی ہوئی کھٹک دار آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
”آخانہ..... آگئیں مہارانی جی! آج کل کہاں گم ہیں محترمہ!“
”کیوں..... میری گشتگی کا اشتہار پڑھ لیا کیا کہیں!“ رانی نے کہیں زیادہ شرارت سے پوچھا۔
”اشتہار تو نہیں..... ہاں اک دل چسپ خبر ضرور سنی ہے۔“ بڑے معنی خیز انداز میں کہا گیا۔

”کون سی خبر؟ اور کس نے سنائی؟“ رانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”دیکھا! اب کیسا دم نکلا؟“

صاحبزادی کو فنی آگئی ریسیور میں بہت ساری نقرئی گفتیاں بج اٹھیں۔
”بھئی..... بتاؤ نا؟“ رانی جھلا گئی۔

صاحبزادی نے فنی جھپٹ کی اور لہجہ بڑا کر بولی۔ ”کون سی خبر ہے؟ جانا چاہتی ہو تو فوراً چلی آؤ ورنہ ہمارے پاس۔ رہا سوال ہمیں کسی نے سنائی ہے تو تمہیں

کالج لائبریری کا وسیع و عریض ہال، یہاں سے وہاں تک خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ اونچی اونچی شیشے کی شاندار الماریوں میں خوبصورت، مجلد کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں۔ علم کے خزانے لیے کتابیں، نصابی اور غیر نصابی کتابیں۔
دوپہر کے سنانے میں اچانک گھڑیاں کی ”ٹن ٹن“ بھاری بھر کم آواز کی طرح ابھری اور بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔ پھر طالبات کے تیز تیز قدموں کی آوازیں راہداری میں ادھر ادھر سے آتی گئیں اور پھر وہی جی کو بھلی نکلنے والی پیاری سی مدھری خاموشی۔

رانی کا فری جھریڈ تھا۔ اس کا فارغ وقت زیادہ تر کالج لائبریری میں گزرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک شیشے کی الماری کے سامنے کھڑی کتابیں الٹ پلٹ رہی تھی۔

اپنے علاوہ اماں بی کے لیے بھی اکڑ کوئی نہ کوئی گھریلو ٹائپ کتاب لے جایا کرتی تھی۔

”پرنسپل صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں۔“

رانی اپنی نحویت سے ابھری تو چہرہ اس سے اطلاع دے کر جا چکی تھی۔ اس نے

اس سے کیا؟ سادہ ہوئی کسی مہاراجہ نے اپنے اپنے ذرائع ہوتے ہیں جی!“

”افروز۔۔۔ بلے پریشان مت کریں! کلاسز شروع ہونے کو ہیں۔ دو بجے سے قیل فارغ نہیں ہو سکتی۔ آپ ابھی بتائیں مجھے۔“

رانی نے مذاق چھوڑ کے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

”جی نہیں۔ ایسا تو قطعی ممکن نہیں مہارانی جی!“ صاحبزادی نے بری وحاشا سے کہا۔

”آج نہیں تو کل۔ آنا تو بہر صورت سہی کو پڑے گا۔“ اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

رانی الجھ کر رہ گئی۔

پتہ نہیں صاحبزادی افروز جہاں نے کیا کہا تھا؟ اور کیا کہنا چاہ رہی تھی!! حد ہو گئی شوخی کی!!! ضرور کوئی بات ہے۔ اُس کا وہی دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ لاکھ ذہن پر زور دیا مگر کچھ سمجھ نہ آئی جانے کو تو وہ ابھی ”قصر دیدار“ چلی جاتی۔ چھٹی مل سکتی تھی اُسے مگر قباحت یہ تھی کہ افروز جہاں اور شاہ جہاں اُسے شام سے پہلے قیامت تک واپسی کی اجازت نہ دیتیں۔ ان کے بے پناہ خلوص کے آگے وہ ہار دیا کرتی تھی۔ ایسی اپنائیت اور اتنی چاہت تو کبھی اُسے ملی ہی نہ تھی۔ دلی طور سے وہ ان کی قدر دان بھی بہت تھی مگر آج تو وہ اماں بی سے کہہ کر بھی نہیں آئی۔ وہ اور شرمین پریشان ہو جائیں لہذا اُس نے آج کا جانا کل پر ملتوی کر دیا۔

یہ نواب فیملی عام نوابوں کی نسبت نہایت ہی عجیب اور حیرت انگیز فیملی تھی۔ انہما سے زیادہ سادہ پُر خلوص اور نیک طبیعت لوگ۔ ظاہری آن بان اور بناوٹی تکلفات سے کوسوں دور۔ حقیقت میں اُن پر آسمان سے زمین پر اتر آنے والے فرشتوں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ تمام احساسات ایسا نہ تھا کہ صرف رانی کے ہی تھے بلکہ یہ لوگ سچ بچ

عام روایات سے ہٹ کر سلجھے ہوئے بہت مہذب اور اعلیٰ کردار لوگوں میں سے تھے۔ جب رانی کا تقرر زریب النساء کالج میں ہوا تو شروع میں پریشانی اور بے پناہ اہل سے اُسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔

قصے کہانیوں میں پڑھنے پڑھانے اور ڈراموں فلموں میں دیکھے ہوئے نوابوں کے عجیب و غریب واقعات اور کہیں لامحدود غرور اور خاندانی تفاخر کے قصوں نے اُسے بہت متاثر اور چونکا کر دیا تھا۔ یوں بظاہر کسی تشویش یا خدشے کی بات بھی نہ تھی کیوں کہ یہاں اُس کی حیثیت محض ایک گورنمنٹ سرونٹ کی تھی ڈیوٹی کو محض ڈیوٹی کی طرح نبھانے کی تھی مگر بہر حال وہ تھی تو ایک لڑکی ہی۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر گھر کی محفوظ چار دیواری سے باہر نکلنے والی لڑکی جسے خراب اور ناسازگار ماحول کا ایک ہی زہریلا جھوٹا کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے اسی لیے ان دنوں نے سنائے نوابی ماحول اور جاگیر دارانہ حرا جوں سے اندر ہی اندر ڈرتی کہتی رہی۔ یہ کالج یوں بھی پریم گڑھ کے اندر واقع تھا اور پریم گڑھ کے مالک و مختار نواب ذوالفقار علی خان مرحوم تھے اور کالج اُن کی ہمیشہ زریب النساء بیگم کا قائم کردہ تھا جو بذاتِ خود پرنسپل تھیں لیکن پھر ہوا یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ رانی پر یہاں کے حالات عیاں ہوتے چلے گئے۔ مہذب اور صاف ستھرے ماحول نے اُس کے اندر کی سبھی ہوئی لڑکی کا ڈر اور خوف اعتماد اور بھروسے میں تبدیل کرنا شروع کر دیا اور وہ دھیرے دھیرے غیر محسوس طور سے نہ صرف کالج بلکہ اپنی پرنسپل کے گھریلو ماحول سے بھی مانوس ہوتی چلی گئی کچھ اور دنوں ہی میں ان کی میٹی شا جہاں اور چچی افروز جہاں کی بے تکلف اور گہری دوست بن گئی۔ من و تو کا تضاد ایسا حرفِ غلط کی طرح مٹا کر دیکھنے والی آنکھ بہ مشکل محسوس کر پاتی۔

نواب ذوالفقار علی خان کو قدرت نے ایک ہی بیٹے سے نوازا تھا۔ نواب زادہ

بچے تھے اور زیب النساء بیگم تھا۔

تقریباً اٹھارہ برس قبل جب نواب صاحب بقید حیات تھے تو پریم گڑھ کے حالات یہ دیکھنے ہی کے لائق تھے وہ ذاتی طور پر انتہائی مختصر باعلاق اور نیک انسان تھے۔ وہ صرف کچھ پروہتی نہ تھے بلکہ اپنی جاگیر کے ہر دل عزیز حاکم تھے۔ پریم گڑھ کے علاوہ اپنی دیگر دیہی اور شہری املاک پر اپنے مرکز پہ بیٹھے بیٹھے ایک گہری نظر اور مکمل کنٹرول رکھتے تھے۔

ان کی سب سے بڑی انسانی خوبی یہ تھی کہ وہ ذاتی 'خاندانی' حسب و نسب اور دولت کی تفریق کے قصب سے پاک ذہنیت کے مالک تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان کے زیر سایہ رہنے والے ان کے عزیز واقارب ان کے بہن بھائی ان عظیم اور اعلیٰ و ارفع خوبیوں سے خالی نہ رہے تھے۔ ایسے عظیم الشان محل اور جاگیر کے مکین اتنے سادہ لوح اور غرور و تکبر سے پاک تھے انہیں قریب سے دیکھنے والی آنکھ اور پرکھنے والے ابن انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔

ان کی وفات کے بعد حالات پر اثر پڑنا ایک لازمی امر تھا۔ تاہم زیب النساء بیگم کی دور اندیشیوں اور معاملہ فہمی نے حالات کو سنبھالا دیا اور رفتہ رفتہ اپنی پرانی ڈگر پر دوبارہ چل نکلے۔ یہاں انہوں نے ایک دور اندیشی مزید اور بروقت کی اور وہ یہ کہ ضروری اور اہم ترین مذہبی تعلیمات سے روشناس کرانے کے بعد صاحبزادہ ویدار علی خان کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے یورپ بھیج دیا۔ وہاں ان کی رہ نمائی اور نگرانی کے لیے ان کے چھوٹے بھائیوں کی موجودگی تھی مگر وہ تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس طرح صاحبزادے بننے اور بگڑنے کی عمر یورپ میں گزار آئے تھے۔ یہاں کے خوشامد اور چالوسی کے ماحول دولت کی ریل پیل اور نوابانہ ٹھاٹھ باٹ و لاڈ پیار سے ملجھ و تعلیم و تربیت نے ان کو ان کی چھوٹی زیب النساء بیگم کے تصورات کے مطابق ڈھالا

دیدار علی خان۔ وہ ابھی کم سن تھے کہ ذوالفقار علی خاں اس دار قانی سے کوچ کر گئے بعض زمانے انسانی زندگی میں ایسے صبر آزما اور دشوار گزار آتے ہیں کہ بے درد مشکلات اور دشواریوں سے سامنا ہوتا رہتا ہے اور شاید ایسی ہی گزریوں کو 'آزمائش' کہا جاتا ہے۔

نواب زادہ ویدار علی خان کی چھوٹی بہن صاحبزادی افرودز جہاں تو والد مرحوم کے انتقال کے تقریباً چھ سات ماہ بعد پیدا ہوئی تھیں اور اسی جائگاہ موقع پر نواب بیگم بھی ان دونوں بچوں کو دارغِ مفارقت دے گئیں۔ ہنسنا ہستا آشیاں لٹ گیا۔ چٹاں چٹاں آواز آ رہی تھی ان دونوں جیم ویر بہن بھائی کی پرورش اور ذمہ داری نواب ذوالفقار علی خان مرحوم کی ہمیشہ زیب النساء بیگم کے حصے میں آئی۔ یوں ان دونوں کی نگہداشت اور پرورش انہی کے ہاتھوں ہوئی لیکن اس فرض کو انہوں نے بہت خوش اسلوبی سے نبھایا۔

زیرب النساء بیگم کی زندگی سے بھی قدرت نے عجیب ستم بردار کھا تھا۔ ان کی شادی خاندان میں ہی ان کے سگے بھوپھی زادے ہوئی تھی مگر ان کے شوہر کچھ ایسے متعلیٰ اور شاہانہ مزاج کے آوارہ گرد سیاح واقع ہوئے تھے کہ انہیں یورپ کے سوا دنیا کا کوئی گوشہ نہ بھاتا تھا۔ ہر سال حُرے سے دنیا بھر کی سیاحت کرتے سیاحت کے حُرے نوٹے اور پھر یورپ میں جاتے۔ سال دو سال بعد ایک آدھ ماہ کے لیے گھر کا چکر لگاتے جاتے۔ اللہ اللہ اور خیر سلا۔

جس زمانے میں نواب صاحب اور بیگم نواب و نیا سے شدھارے خود زیب النساء بیگم کی اکلوتی بیٹی شاہ جہاں بھی ذرا سی تھی۔ چنانچہ چھ انہوں نے بیٹی اور بیٹی کو ایک جیسا پیار دے کر بیک وقت پالا تھا۔ صاحبزادہ ویدار علی ان دونوں لڑکیوں سے بڑے تھے۔ دونوں لڑکیاں ہم عمر بھی تھیں تو ہمیشہ و بھی۔ بڑا مشکل اور کھن وقت تھا۔ یہ

لہذا انی نے کبرام پکا کر ڈالا تھا اور تینوں بچے چھوٹے چھوٹے تھے ستم بالا ہے ستم یہ کہ
 اودان کے میاں بھی چند ماہ ان کے غم میں برابر کے شریک رہنے کے بعد حسب معمول
 ایسا بھر کے سیاحت کو کھل گئے تھے اگر کوئی معمولی اعصاب کی خاتون جو تیس تو کچھ
 غم غم اور جھٹکیں مگر انہوں نے صبر و تحمل جو صلے اور امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا
 اور اپنے اپنی ارادوں کے بل بوتے پر حالات کے خلاف چٹان کی طرح سینہ سپر رہیں
 اور بلا آخر باوجود خزاں نے بہاروں کے نوخیز جھونکوں کا روپ دھار لیا اور ان کی امیدوں
 اور رمالوں کا نکلستان لہلہا اٹھا۔ ہر طرف بہاروں کی روپیلی اور سر آفریں گلیاں چمک
 اٹھیں اور صحن گلشن میں پھولوں کے انبار لگتے چلے گئے۔

ان کے کالج کا شمار بہترین کالجوں میں ہونے لگا۔ اُن کا نام آنے دن
 اخبارات کی زینت بنا۔ لوگ تعریفیں کرتے نہ جھکتے مگر خود ان کے اندر احساس
 فخر یا غرور و تکبر کا ذرہ بھر شائبہ تک نہ تھا۔ اک بے پناہ بردباری اور مٹی کو چھو لینے والا
 وقار تھا جو ان کی شخصیت کا احاطہ کیے رہتا۔

اور رانی وہ پرستش کی حد تک ان کی عداوت تھی۔



تھا۔ اب جبکہ وہ بہترین انسانی اوصاف، بلند کردار اور انسانی اقدار کے قدردان اور
 مہذب سوسائٹی کے روح رواں بن کر لوٹے تھے کیوں کہ یورپ میں جہاں ان کے
 بھوپچا ان کے راہبر ہی نہیں بہترین دوست اور ساتھی بھی تھے۔

یہ پوری نواب فیملی انسانی قدروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ نئے زمانے
 کے نئے اصولوں اور اہم ترین تقاضوں کو بھی اپناتے ہوئے تھی۔ انہیں کسی بات میں
 پیچھے رہ جانا قبول نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بچوں کے بڑے ہوتے ہی زیب النساء بیگم نے
 ”قصر دیدار“ کے قریب ایک وسیع و عریض قطعہ زمین ہموار کروا کے لڑکیوں کے لیے
 ایک عظیم الشان عمارت بنوا کر کالج منکھور کروا لیا تھا۔ دور سے آنے والی لیکچرز اور
 طالبات کے لیے ہوٹل کی سطحہ عمارت ان کے طعام و قیام کے علاوہ کھیل کے میدان
 اور ایک تفریحی کلب کا انتظام کیا تھا۔ یہاں اساتذہ اور طالبات کے لیے غیر مشروط طور
 سے قیام و طعام کے انتظامات انتہائی آسان اور تقریباً بلا معاوضہ رکھ کے زیب النساء
 بیگم نے ایک قابل قدر مثال قائم کی تھی۔ ایسی مثال جس کی نظیر ملنی ناممکن ہوتی ہے۔

پھر اُن کا پرنسپل کے عہدے پر بلا معاوضہ خدمات انجام دینا گو کہ یہ سب ان
 کے کسی دیرینہ شوق کی تکمیل کا باعث بنے تھے۔ تاہم ایسے تعمیراتی انداز میں سوچنا اور
 پھر اس سوچ کو عملی جامہ اس کے خطیر اخراجات کے ساتھ پہنانا معمولی کام نہ تھا۔
 خاندانی نوابوں کے رسم و رواج اور پرانی روایات کے خلاف یہ ایک انتہائی جرأت
 مندانہ اقدام تھا مگر وہ اس امتحان میں بھی پورے نمبروں سے کام یاب رہیں۔ آج
 اُن کے ان اقدامات کے قدردانوں کی بھی کمی نہ تھی ہر جگہ سراہی جاتیں۔ وہ خود بھی
 زیور تعلیم سے آراستہ تھیں اور اپنے پرائے سب کے بچوں کو بھی بہترین تعلیم سے
 روشناس کرا رہی تھیں۔

شاہراہ حیات کے اُس ناقابل فراموش موڑ پر جب نواب ذوالفقار کی اچانک

گھرے جھکی جھکی ٹہنیوں والے کنج میں ٹیپ ریکارڈ اور پسندیدہ نغموں سمیت موجود ہوئی اور حقیقت بھی یہی تھی۔

افروز جہاں سبزے پر نیم دراز موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ خود رانی بھی عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جہاں لڑکے لڑکیاں راگ رنگ سے فیض یاب ہونا اپنا پیداؤں ہی سمجھنے لگتے ہیں مگر ان لمحوں میں صورت حال مختلف تھی۔ اس نے نیچے جھک کر ٹیپ ریکارڈ کے ٹین پر ایک انگلی سے دباؤ ڈالا اور خود مزے سے سبک مرمر کی شیخ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

فضائیں یک لخت خاموش ہو گئیں۔

افروز نے چونک کر رانی کی طرف دیکھا اور چپک کر بولی۔ "آخا! تو مہارانی کی تشریف لے آئیں۔ کیسے سرکار! کیسے مزاج ہیں۔ عید کا چاند ہو گئیں حضور تو!"

"مزاج بھی بد خیر ہیں اور عید بھی نزدیک ہے اس لیے چاند بن جانے میں بھی کیا مضائقہ ہے۔" رانی نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"ہاں آپ فرمائیے یہ فون پر اشتہار بازی کس خوشی میں ہو رہی تھی؟"

افروز نے پے مشکل لمبی ضبط کی اور بناوٹ سے بولی۔ "اللہ بھئی! ہمیں تو کمروں میں بڑی گھٹن محسوس ہو رہی تھی اس لیے یہاں گھنی چھاؤں میں آ بیٹھے۔ تم کو تو اندر بلاتے ہیں۔"

"کیا مصیبت ہے؟" رانی اس کی بے نیازی اور بے پرکی اُڑانے پر جھلا گئی۔

آپ کو شوقی ٹو جھ رہی ہے اور میری جان پر نئی ہے۔ جلدی بتائیے وہ کل والی بات تھی۔ ابس بھی جاتا ہے۔"

"تو جاؤ! روکا کس کا فرنے ہے؟" وہ اُسی بے نیازی سے بولی۔

"اور..... وہ بات؟" رانی پوری طرح سنجیدہ تھی۔

دن کے دس بجے تھے تیز چلپاتی ہوئی زرد زرد صوب ہر طرح پھیلی ہوئی تھی۔ عام دنوں کی نسبت آج کا دن زیادہ ہی گرم لگ رہا تھا جسم و جاں سے گرمی کی لپٹیں دو آغوشی لگ رہی تھیں۔ پہلا پیر یے قسم ہوتے ہی رانی نے اسٹاف روم کا رخ کیا۔ پیار سے چٹختے ہونٹ خشک کرتی وہ کولر سے ہٹی ہی تھی کہ اپنی پر پھل سے ٹکراتے ٹکراتے پچی۔

"رانی بیٹی! آپ سیدھی گھر پہلی جائیں۔ لڑکیاں کئی دنوں سے انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کے پیر یے مسز جوزف کر لیں گی۔" انہوں نے ایک لمحہ تھم کر اسے ہدایت کی اور آگے بڑھ گئیں۔

صاحبزادی افروز جہاں سے کیا ہوا وعدہ اُسے یاد تھا۔ وہ خود بھی وہاں جانا چاہ رہی تھی۔ لہذا فوراً سے پیش تر "قصر دیدار" چل دی۔ رہائشی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے ہی صاحبزادی کی ملازمت نے اُسے بتا دیا کہ وہ پائیں باغ میں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

رانی جانتی تھی وہ زرد لگا ہواں کی دیوانی ہے اور اس وقت اپنے پھولوں سے

ہوئی تھی۔ کہیں کہیں خریف کی فصل کے لیے خالی پڑے کھیتوں کو تیار کیا جا رہا تھا۔ کئی پاس کھاد اور باجرے کی بوائی ہو رہی تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اُسے ہول سی ہو رہی تھی کچھ دن پہلے کا واقعہ یاد آ رہا تھا جب بس کا ٹائر پچھڑ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا مگر ہر دفعہ ایک ہی واقعہ تو وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

آج جلد ہی بس مل گئی۔ بس میں سوار ہوتے ہوئے اُس نے دیکھا لمبی سی خوب صورت گاڑی بہت ست رفتاری کے ساتھ اُس کے قریب سے گزری اور گہری گہری تیز آنکھوں والا شخص اُسے بخور دیکھتا چلا گیا۔ وہی اُن جانا اور اجنبی سا شخص جس کا نام تک پوچھنا وہ بھول گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد اماں بی سونے کے لیے لیٹ گئیں تو رانی اور شرمین باتوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے کی میز میوں پر آدھ بیٹھیں یہ روزانہ کا معمول تھا اُن کا۔ چاند ابھی نہیں لٹکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پرسکون تاریکی روح میں اُتری جا رہی تھی۔ بعض اوقات اُجالوں کے بجائے اندھیرے جی کو کتنے بھلے لگتے ہیں ایوں لگتا ہے جیسے ہم جو کچھ سوچ رہے ہیں ہماری تصویر کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے باقی ساری کائنات اُس سے بے خبر ہے۔ یہ احساس ہی کتنا اپنا اپنا سا اور سکون بھرا ہوتا ہے!

رانی خیالات کی یلغار سے نکلی تو شرمین کو کہتے سنا۔ ”آپ کو خبر ہے آپلی! آج علی بھائی پھر آئے تھے۔“

”کون علی بھائی؟“ رانی نے بہت چونک کر بڑی حیرت سے پوچھا۔

”ارے آپ اتنی جلدی بھول گئیں؟ وہی جو اُس روز آپ کو ڈراپ کرنے آئے تھے۔“ رانی کی حیرت بد قرار رہی لیکن شرمین سخت ناراض تھی۔ اُسے اپنی آپلی کی اس ہم لئے والی عادت سے چڑھتی۔

”کون سی بات!“ تجاہل عارفانہ پر قرار تھا۔

”وہ..... جو آپ کو کسی ”مہاراجا“ نے بتائی تھی۔“ رانی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”کیا کہا.....؟ مہاراجا؟ واہ وا..... کیا کہتے ہیں..... سبحان اللہ..... خدا جانیے ان خوش گمانوں کے۔“ افروز جہاں سے مزید برواشت نہ ہو سکا اور پیٹ میں اٹھنے والی ہسی کے گولے آزاد ہو گئے۔

اب صاحبزادی شاہ جہاں بھی آ کر شریک محفل ہو گئی تھی۔ ان دونوں قبیلوں سے پائیں باغ کا یہ پھولوں بھرا گوشہ گونج اٹھا۔

رانی ان قبیلوں کے درمیان بوری صورت بنائے بیٹھی رہی۔ جلد ہی شاہ جہاں کو اس کی بوری کا احساس ہو گیا۔

”بھئی کمال کرتی ہو رانی تم بھی! یعنی بڈل پر ایمان لے آئیں تم؟“

”کیوں جی؟“ رانی نے افروز جہاں کو گھور کر دیکھا۔

افروز جہاں جھٹ آداب بجالائی اور شرارت سے ترنم کے ساتھ گویا ہوئی۔

”جو..... فون تھا اک بہانہ تھا..... اس بہانے تجھے..... بلانا تھا.....

اور سنا کر یہ..... سارے ”ریکارڈ“ تجھے.....

تیرے احساس کو..... جگانا تھا۔“

اس تک بندی پر رانی کو بھی ہنسنا پڑا مگر جانے کیوں اُسے لگ رہا تھا جیسے دونوں اس سے کوئی بات نہ چھپا گئی ہیں۔ گہری دوستی کی بنا پر وہ ان لوگوں کی رگڑ سے واقف تھی۔

اُسی شام قصر دیدار سے نکل کر شام کے تقریباً چائے بجے رانی بس اسٹاپ پر گئی۔ بس کا انتظار کر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب میلوں تک نواب فیلی کی اراشی

شرمین کے انکشافات اُسے حیرت میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ آخر ماں بی کو کیا ضرورت تھی ایک غیر اور ان جانے شخص سے مراسم بڑھانے کی! خبر نہیں کون اندر سے کیا ہوا چاہتا ہوا بھلا کوئی کسی کے اندر تک کس طرح لہا تک سکتا ہے۔ جتنا خطرناک زمانہ اسے تشویش ناک حالات مگر جانے کیوں کوئی بہت اندر سے اُسے تسلیاں دیے جا رہا تھا۔ ”چاہے کوئی بھی وہ وہ بہت شریف بہت سچا شخص ہے۔“

بعض انسانوں کی زندگی آزمائشوں سے عبارت ہوتی ہے۔ رانی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا جن کی زندگی بے درپے مشکلات اور آزمائشوں سے نہ ہوتی ہے۔

کلم سنی کے دور سے ہی قدرت نے اُس پر کئی ستم کر ڈالے تھے لیکن جب بہت سی سی تھی تو گھر کا ماحول بہت پرسکون خوب صورت اور آسودہ ہوا کرتا تھا۔ تب تک تو گمان بھی نہ تھا کہ آگے تقدیر کیا کرنے کو ہے۔ اماں ایادوںوں ہی بڑے پیار کرنے والے ناز اٹھانے والے اور ہر فرمائش پوری کرنے والے تھے۔

ابو ایک مصروف آدمی آفیسر ہونے کے باوجود اپنی فرصت کا ہر لمحہ گھر پر گزارنا پسند کرتے تھے۔ لمبے چوڑے صحت مند اور گورے چٹے سے ابوا سے بہت سی اچھے لگا کرتے تھے۔ اماں بی سے بھی زیادہ اچھے۔ بچوں کی مانند اُس کے ساتھ خوب کھیلتے۔ کہہ داتے ہنساتے۔ ہر گھڑی توجہ دینے والے۔ بعض اوقات وہ انہیں اخبار تک نہ پڑھنے دیتی اور وہ ہنساٹے بغیر اپنی پوزیشن اور قد وقامت فراموش کیے بیٹھنے کے بل کھڑا بنے ڈرائنگ روم کے قالین پر اُسے لاوے سارے میں دوڑتے پھرتے۔ کبھی کبھی تو اس کے ساتھ گزریاں کھیلتے بھی بیٹھ جاتے۔

اماں بی یوں تو بہت سی فرماں بردار بیوی اور پیار کرنے والی ماں تھیں بے حد نرم

رانی کے ذہن کو شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ بی کو ایک بے چینی سی لگ گئی۔ تیزی سے پوچھا۔ ”تمہیں..... ان کا نام کس نے بتایا؟“

”کمال کرتی ہیں آپلی آپ بھی!“ شرمین نے چکر مارا تسکی سے جواب دیا۔

”نام تو وہ اپنا خود اس روز بتا کر گئے تھے اور کون بتاتا بھلا!“

”اچھا..... تو پھر آج کیوں آئے تھے؟“ رانی ابھی تک بیٹھائی ہوئی سی تھی۔

اب شرمین کو اس کی بے خبری پر ہنسی آگئی۔ مذاق اڑا کر بولی۔ ”لٹنے آئے تھے اماں بی سے اور کیوں آئے تھے۔ وہ تو آج میں اسکول سے جلدی آگئی تھی تو مل گئے مجھ سے بھی اور نہ اماں بی کہتی ہیں وہ اکثر لٹنے آتے رہتے ہیں ان سے۔“

”ہائیں..... اماں سے لٹنے آتے رہتے ہیں؟“ رانی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

شرمین اس کی کیفیت سے بے پروا اپنی دھن میں بولتی رہی۔ ”ویسے آپلی! ہیں بڑے لا جواب یہ علی بھائی۔ اتنا ہنساتے ہیں..... اتنا ہنساتے ہیں کہ پیٹ میں درد ہوتے لگتا ہے۔ بہت مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں پتا ہے کہہ رہے تھے تمہاری آپلی تو خود اتنی سی ہیں..... منی سی وہ کیا لکچر دیتی ہوں گی لڑکیوں کو..... اٹلا انہی سے بیافیاں کھا کر آ جاتی ہوں گی۔“

رانی کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

اندھیرے میں اس کی مدھم مدھم سی آواز سن کر شرمین مزید شیر ہو گئی اور اس کا ہاتھ تھام کر بتانے لگی۔ ”اور پتا ہے آپلی..... علی بھائی کہہ رہے تھے تمہاری آپلی کے پاس تو ایم۔ اے کی نقلی ڈگری ہے۔ وہ سچ اتنا پڑھی ہوئی تھوڑی ہیں۔ خالی خولی زحمت جاتی رہتی ہیں۔ تم بالکل ان کا کہنا مت مانا کرو۔ تم سے تو وہ بالکل بڑی نہیں لگتیں۔“

سورت دیکھے بغیر بندہ روہ میں چلے جاتے۔

زندگی کے اُس دور میں وہ اتنی نا بوجھ معصوم اور کم سن لکھی کہ گھر کے ماحول میں آنے والے دن رونما ہونے والے ایسے واقعات کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت سے بے بہرہ تھی۔ اُس کی نادانی کی انتہا یہ تھی کہ لاشعوری طور پر وہ ایسی "آن بن کی منتظر رہا کرتی کیوں کہ ایسی "جھڑپ" کے فوراً بعد تو اُس کی گویا عید ہو جایا کرتی تھی۔

ابتدائی عمر کے بہت سارے دن ایسے ہی عجیب معمولات کی نذر ہوتے گئے اور وقت آگے بڑھتا گیا۔ وہ چار برس کی ہوئی تو اماں بی نے اُس کے لیے ایک بزرگ بی بی کا انتظام کیا جو صبح و شام اُسے دینی علوم کا درس دینے آئے تھیں۔ وہ بڑے اہتمام اور ادق و شوق سے ان کے سامنے مناساد و تہ لپٹ کر بیٹھنے لگی۔ بڑی بنجیدگی اور متانت سے ہل ہل کر سبق یاد کرتی۔ اماں بی اُس کی بھولی بھالی اداائیں دیکھ دیکھ کر ہنسنے لے لے مانتیں اور بار بار اُس کی بلائیں لیتی نہ بھکتیں صدقے واری جاتیں۔

تجھی ایک روز ابو نے ایک دوسرا ہی کام کر ڈالا۔ انہوں نے اماں بی کے نظریے کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ان سے مشورے کی ضرورت سمجھی۔ ان کی ہستی کو مکمل نظر انداز کر کے رانی کو کافوینٹ میں ایڈمیشن دلوا ڈالا۔

جیسے وہ فقط انہی کی بیٹی ہو۔ اماں بی سے اُسے کوئی تعلق نہ ہوا جس رات کی صبح رانی کو گھر سے ہوسٹل میں منتقل ہونا تھا اُس رات کے جانے کون سے پہر تیز قسم کے ہنگامے سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران و پریشان مسہری کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی اور سوئی سوئی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

ابو اور اماں بی کے درمیان بڑی شان دار قسم کی جھڑپ ہو رہی تھی۔ اُس نے پہلی مرتبہ اماں بی کو لادنی آواز میں بولنے سنا۔ اُن کا چہرہ غم و غصے کے اظہار میں تپا تپا سا ہو رہا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ "حشر ہو جائے گا" میں لڑکی کو آپ کے اُس کا

دل نرم ہو اور ہر کسی کا خیال رکھنے والی مگر انہیں اس وقت جانے کیا ہو جاتا تھا۔ ابوا انہیں باہر کہیں لے جانے پر اصرار کرتے۔

پس اس ایک بات پر وہ بے طرح چڑتی تھیں۔ وہ بازاروں و رستورانوں سے باہر ادھر ادھر کھلے عام ہیر پھانوں کو بہت معیوب تصور کرتی تھیں۔ کس گید، انینڈ کرنا تو ان کے نزدیک بدترین گناہ تھا۔

وہ سارا وقت گھر پر ہی مڑے سے گزار لیتیں اور کئی ملازموں کے ہوتے ہو بھی مختلف کاموں میں الجھی رہتیں۔ وہ گھر کے اندر ہی رہنا پسند کرتیں باہر کہیں پسند نہ کرتیں۔ وہ یہاں تک نئی تہذیب اور اس کے تقاضوں سے متنفر تھیں کہ ابو بے حد اصرار کے باوجود رانی کے منہ سے اپنے لیے "ممی" کا لفظ سننا برداشت نہ کرنا تھیں اگر رانی کبھی دوسرے لوگوں کے بچوں کی دیکھا دیکھی لاڈ میں آ کر "ممی" کہہ مخاطب کر لیتی تو بلا لحاظ کیے اُسے بے نقط سنا ڈالتیں۔

بسا اوقات جانے کیوں ابو کو ڈھیروں غصہ آ جاتا۔ چہرہ بہت ہی زیادہ تپ سرخ ہو جاتا۔ ڈرائنگ روہم کی آرائشی اشیاء اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنے لگتے۔ اماں دھیمے سروں میں کوئی بات کہہ کر کچن میں جا کھیں اور ابو زور زور سے بولنے لگتے قالین پر پاؤں پیچ پیچ کر چلتے۔ سر سے پاؤں تک اُن کی ہر جنبش اُن کے بے پناہ جلال کی مظہر بن جاتی مگر ایسے فطرتاً کہ وہ میں بھی رانی سے کبھی پیشانی پر تل ڈال کر نہیں مخاطب ہوئے۔ اس سے ان کی محبت اور الفت میں ذرہ بڑھانہ کی نہ آنے پاتی۔ پھر خود بخود ہی اُن کا غصہ اور بے پناہ جلال دھیمہ پڑ جاتا۔ اماں بی سے کچھ کہے سے بغیر رانی کی انگلی پکڑے جیب میں جا بیٹھتے اور اُسے پورا شہر گھمالاتے۔ کون کھلاتے تصاویر والی کتابوں بہت سارے کھلونوں کے ساتھ رنگین پٹلیں جوڑتے رہن ہیر جینڈا ہیر بھیل ل کرتے بے بی فراکوں کی شاپنگ کے بعد رات کے گھر لوٹتے اور اماں بی کی

فونٹ میں ہرگز ہرگز نہ سمجھوں گی۔ اب آپ اپنی کوہستانی بنانا چاہتے ہیں! اس کا انگریزی پڑھنا ہرگز ضروری نہیں ہے اور وہ بھی گھر سے دور ہوٹل میں رہ کر۔۔۔ غضب خدا کا آپ کو مشرقی قدروں کا ذرا احساس نہیں رہ گیا۔ بھلا اس کی عمر ہی کیا ہے! جہاں آپ اسے گھر سے بے گھر کیے دے رہے ہیں۔ ہائے معصوم بچی۔۔۔

اتنا کہتے کہتے اُن کی آواز بھگ گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔

”آپ کو اگر روٹنا ہی ہے تو براؤ کرم دوسرے کمرے میں جا کر روئیے بچی کی نیند حرام مت کیجئے۔“ رات کے سنانے میں ابو کی بھاری آواز گونجی۔

سگار کا کش لے کر وہ ٹپکتے ہوئے اماں بی کے قریب ز کے۔ لحو بھرا نہیں دیکھتے رہے پھر بہت حقارت سے غرغھ لہجے میں کہنے لگے۔ ”میری زندگی بھر کا الم تاکہ سانچو اور بھیا تک فطلی یہ تھی قیصر جہاں کہ میں آپ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لعنت ہو مجھ پر۔“

”کاش! وہ وقت پلٹ کر آ جائے تو میں آپ کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کروں کیوں کہ مجھے آپ جیسی جہالت سے بدعورت کی ضرورت قطعی نہیں۔ میں ایسی دقیانوسیت سے پناہ مانگتا ہوں۔ اتنے عرصے میں میں نے کیا کیا کوشش نہ کر ڈالی کہ آپ کو ہم خیال بنالوں! آپ میرے تصورات کے مطابق ڈھل جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ گوشت پوست کی انسان نہیں! احساسات اور جذبات سے عاری پتھر ہیں جس سے آج تک میں سر پھوڑا رہا اور آپ وہی لکیر کی فقیر رہیں۔ آپ کی بے پناہ جہالت! گود ذوق! ذہنی پس ماندگی سے میں نفرت کرتا ہوں! بے پناہ نفرت اور آج سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کے معاملات میں کبھی دخل انداز نہ ہوں گا مگر ساتھ ہی آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میری سوچوں اور میرے ارادوں کے درمیان حائل ہونے کی آپ بھی کبھی کوشش نہ کرنا۔ میں اپنے گھر کا ذمہ دار ہوں اپنی اولاد کی بہبود اور بہتری

کے لیے آپ سے بہتر سوچ سکتا ہوں۔ میں اپنے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہوں اس لیے کان کھول کر سن لیتے کہ جو میں چاہوں گا وہی ہوگا بس۔“

”نہیں۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔“ اماں بی ٹپٹی ٹپٹی آواز میں چلا گئیں۔

”میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بچی کو آپ جیسی بیک ورڈ اور جاہل خاتون کے

زیر سایہ پرورش پانے دوں۔۔۔ کیوں کہ سن شعور کو پہنچے پہنچے آپ یقیناً اسے اپنے رنگ میں رنگ لیں گی۔ وہ آپ کی فوٹو اسٹیٹ بن جائے گی اور ایسا میں تاحیات نہ ہونے دوں گا۔ میں اپنی بچی کو نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ترین زیورات سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں یہ خیال اس گھر کے جہالت آمیز ماحول میں ہرگز پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ چناں چہ وہ یہاں رہ کر نہیں چڑھے گی بلکہ ہوٹل میں رہے گی پھر اس کا رجحان ہوگا تو میں اسے فارن بھیج دوں گا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو ایسے قسم کی اجازت

نہیں دے سکتی۔ کبھی نہیں!“

اماں بی بے تحاشہ چلاتی ہوئی ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ابونے سگار کی راکھ جھاڑی پھر ان کی ساری بے تابی اور بے قراری نظر انداز کر کے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔ ”میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جس کو بدلنے کا آپ ہرگز کوئی حق نہیں بلکہ آپ کو اس کے درمیان دخل اندازی کی ہمت بھی مت کریں۔ رانی میری بیٹی ہے اور میں اس کی تمام تر فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل کا ذمہ دار ہوں جو کچھ میں اس کے لیے سوچ چکا ہوں اسی پر عمل کروں گا بلکہ اب تو میں اس کو چھٹی کے دن بھی آپ سے ملنے نہیں دوں گا۔ بس یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔“

”آہ!۔۔۔ یہ ظلم ہے۔ سراسر ظلم۔ آپ انسان نہیں بلکہ پتھر ہیں۔ بے

رحم ہیں۔ سنگ دل ہیں۔ ظالم ہیں۔ آپ کے اندر انسانیت نام کی۔“

نوینٹ میں ہرگز ہرگز نہ سمجھوں گی۔ اب آپ اپنی کویسائی بتانا چاہتے ہیں؟ اس کا انگریزی پڑھنا ہرگز ضروری نہیں ہے اور وہ بھی گھر سے دور ہوٹل میں رہ کر۔ غضب خدا کا آپ کو مشرقی قدروں کا ذرا احساس نہیں رہ گیا۔ بھلا اس کی عمر کیا ہے! جو آپ اسے گھر سے بے گھر کیے دے رہے ہیں..... ہائے معصوم بچی۔"

اے کہتے کہتے ان کی آواز بھینگ گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔
 ”آپ کو اگر رونا ہی ہے تو براؤ کرم دوسرے کمرے میں جا کر روئیے بچی کی نیند
 حرام مت کیجئے۔“ رات کے سنانے میں ابو کی بھاری آواز گونجی۔

سنگار کا کش لے کر وہ ٹپکتے ہوئے اماں بی کے قریب رُکے۔ لہجہ بھرا نہیں دیکھتے رہے پھر بہت حقارت سے غرش لہجے میں کہنے لگے۔ ”میری زندگی بھڑکا الم ناک سانچہ اور بھیا تک غلطی یہ تھی قصیر جہاں کہ میں آپ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لغت ہو مجھ پر۔“

”کاش! وہ وقت پلٹ کر آجائے تو میں آپ کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کروں کیوں کہ مجھے آپ جیسی جہالت سے پُر عورت کی ضرورت قطعی نہیں۔ میں ایسی دنیا نویسیت سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس عرصے میں میں نے کیا کیا کوشش نہ کر ڈالی کہ آپ کو ہم خیال بنالوں آپ میرے تصورات کے مطابق ڈھل جائیں مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ گوشت پوست کی انسان نہیں احساسات اور جذبات سے عاری پتھر ہیں جس سے آج تک میں سر پھوڑتا رہا اور آپ وہی لکیر کی فقیر رہیں۔ آپ کی بے پناہ جہالت، کور و قی، چھنی پس ماندگی سے میں نفرت کرتا ہوں، بے پناہ نفرت اور آج سے عہد کرتا ہوں کہ آئندہ آپ کے معاملات میں کبھی دخل انداز نہ ہوں گا مگر ساتھ ہی آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ میری سوچوں اور میرے ارادوں کے درمیان حائل ہونے کی آپ بھی کبھی کوشش نہ کرنا۔ میں اپنے گھر کا ذمہ دار ہوں اپنی اولاد کی بہبود اور بہتری

کے لیے آپ سے بہتر سوچ سکتا ہوں۔ میں اپنے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہوں اس لیے کان کھول کر سن لیجئے کہ جو میں چاہوں گا وہی ہوگا بس۔“

”نہیں.... ایسا پرگز نہیں ہو سکتا۔“ اماں بی ٹی ٹی ٹی ٹی آواز میں چلا نہیں۔

”میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بیٹی کو آپ جیسی بیک ورڈ اور جاہل خاتون کے زیرِ سایہ پرورش پائے دوں..... کیوں کہ سن شعور کو بچتے بچتے آپ یقیناً اسے اپنے ربک میں رنگ لیس کی۔ وہ آپ کی فوٹو اسٹیٹ بن جائے گی اور ایسا میں تاحیات نہ ہونے دوں گا۔ میں اپنی بیٹی کو نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ترین زیورات سے آراستہ کرنا چاہتا ہوں یہ خیال اس گھر کے جہالت آمیز ماحول میں ہرگز پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ وہ یہاں رہ کر نہیں پڑھے گی بلکہ ہوٹل میں رہے گی پھر اس کا رجسٹر ہوگا تو میں اُسے فارن بھیج دوں گا۔“

”نہیں..... نہیں۔ آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو ایسے ستم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کبھی نہیں!“

اماں بی بے تحاشہ چلاتی ہوئی اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ابو نے سگاری راکھ بھٹائی پھر ان کی ساری بی بات بی اور بے قراری نظر انداز کر کے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔ ”میرا فیصلہ آخری فیصلہ ہے جس کو بدلنے کا آپ ہرگز کوئی حق نہیں بلکہ آپ کو اس کے درمیان دخل اندازی کی ہمت بھی مت کریں۔ رانی مہری جینی ہے اور میں اس کی تمام تر فلاح و بہبود اور بہتر مستقبل کا ذمہ دار ہوں جو کچھ میں اُس کے لیے سوچ چکا ہوں اسی پر عمل کروں گا بلکہ اب تو میں اس کو چھٹی کے دن بھی آپ سے ملنے نہیں دوں گا۔ بس یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔“

”آؤ! یہ ظلم ہے۔۔۔۔۔ سراسر ظلم۔۔۔۔۔ آپ انسان نہیں بلکہ چھر ہیں۔۔۔۔۔“

روتے دھوتے انہوں نے اپنی تخت جگر کو اپنے ہاتھوں بنا سوار کر ہاسٹل بھیج دیا اور خود یہاں سے وہاں تک سسنان اور ویران پڑی کوٹھی میں بے یمن و بے قرار روح کی طرح آجاڑون گزرنے لگیں۔

زندگی نے اپنا راستہ از خود بنالیا اور خاص ڈگر پر چل اٹلی۔

رانی ہوٹل کی دل چسپیوں اور گہما گہمی میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ بنے سنورنے کا میل طویل ہوتا گیا یوں لگتا جیسے وہ ہوٹل میں پیدا ہوئی ہوٹل ہی میں تاحیات رہے گی اور یہیں مر کھپ جائے گی۔

ابو نے واقعی اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔ ہر بختے خود ہی اکیلے اُس سے ملنے چلے آتے۔ ڈیڑھ روٹ کتابوں کھلونوں اور رنگارنگ بیکنوں سے لدھے پھندے جیسے بس رانی کو انہی چیزوں کی ضرورت ہو۔ اسے کسی بھی چھٹی پر کھڑے کر نہ جاتے اور نہ ہی اماں بی سے ملنے کی اجازت دی۔ دونوں ماں بیٹی کیسے کیسے نہ تڑپی ہوں گی؟ رانی کی تو خیر بہت سی پیاری پیاری دوست بھی بن گئی تھیں۔ بھلانے پیارے کرنے اور تازہ اٹھا نے کو صاف ستھری تعلیم یافتہ گورنس بھی تھیں۔ پڑھنے لکھنے اور کھیلنے کودنے کے اسنے مواقع کم کم ہی میسر آتے لیکن جب ماں اور اُس کی دل داریاں یاد آئیں تو بے یمن ہو جاتی۔

اماں بی کو تو وہیل پیل یا ڈاؤتی۔ وہ جدائی کے لمحات کانٹوں کی جگ پر تڑپ تڑپ کر گزار رہی تھیں۔ جاڑے کی لمبی راتیں اور گرمی کے طویل دن آزمائش بن کر گزر رہے تھے۔ وقت بوند بوند بن کر ٹپک رہا تھا۔ ماں بیٹی کے درمیان وقت دو دھاری کمواری ماند حائل تھا مگر طمن رُت مہربان نہ ہوتی تھی۔ دل پر لگے گھاؤ گہرے ہی ہوتے گئے منہ دل ہونے کے آچار دکھائی نہ دیتے تھے۔ ابو پر ضد اور ہٹ دھرمی کا بھوت سوار تھا۔ شاید اُن کی فطرت میں سختی تھی بلکہ سخت دلی کی انتہا تھی ان پر۔ ایک دن

”شٹ آپ..... میں کہتا ہوں بند کر دیہ بکواس۔“ ابو کا چہرہ تھما اٹھا اور ہاتھ ”چٹاخ“ کی زوردار آواز کے ساتھ اماں بی کے زخموں پر جا پڑا۔ رانی کے ہاتھ بیروں کا دم نکل گیا۔

وہ دم سے بستر پر گری اور نکلے سے بری طرح چٹ گئی۔

دو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ انتہائی خوف اور گھبراہٹ سے اُس کی منہ ہی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اسی غنی قسم کی واردات اور آنکھوں دیکھے تھم پر اُس کی آنکھوں کے آنسو تک خشک ہو گئے تھے۔ کیا آنکھوں نے دیکھا تھا اور کیا کانوں نے سنا تھا۔ دونوں تو ناقابل یقین اور ناقابل تردید واقعات تھے۔

اُس رات اُس کا ننھا سا ذہن سن ہو کر رہ گیا۔

ابو کے اُس خطرناک زوہپ نے اسے سہا کر رکھ دیا۔ اپنی دانست میں وہ اسی کی بہتری کے لیے یہ اقدام کر رہے تھے مگر ان کے انداز تیور اور جارحانہ رویہ ہمیشہ کے لیے منی سی رانی کے دل و دماغ پر ایک گہرا اور ان مٹ نقش بن کر ثبت ہو گیا۔ لڑنے والے دونوں خریق بیٹی کی ذہنی اذیت اور روحانی کرب سے بے خبر اپنے اپنے موقف پر شد و مد سے ڈٹے ہوئے تھے۔

دوسری صبح رانی کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے رات کا آنکھوں دیکھا واقعہ ذہن کی اسکرین پر بڑے واضح انداز سے چلنے لگا۔ اُس نے گہرا کر کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ذہن کو زبردست شاک لگا۔ وہ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگی مگر منظر تبدیل نہ ہوا۔ اماں بی دوپٹے کے آئینل سے آنسو پونچھ پونچھ کر بڑے سے اپنی میں اس کے ننھے منے خوش رنگ لباس اور کتابیں کاپیاں رکھ رہی تھیں۔ دوسرے لفٹوں میں انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور میاں کے فیصلے پر لبیک کہہ کر اپنے سینے پہ تھر کی سہل رکھ لی تھیں۔

میں دخل کر رہ جاتی ہے اور خود چاہے ورثے میں کرائے کا مکان ہی چھوڑیں لیکن وارث تو بہر حال اُن کو چاہیے۔ بے چاری لڑکیاں بھلا کس طرح وارث قرار دی جاسکتی ہیں؟ ان کے ذریعے کون سا باپ دادا کا نام آگے چلنا ہوتا ہے؟ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جی لڑکی کیا پیدا ہوئی ہماری آدمی مونچھ پتلی ہو گئی اب ہم نہ کسی کو کیا دکھائیں! کیسے دکھائیں! لڑکی ذات کی پیدائش سے کون سا شان میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مزید پریشانیاں اور مستقبل کے تفکرات ہی اُن گھیرتے ہیں۔ ہائے کل کو یہ نہ ہو ہائے دہ نہ ہو جائے شادی کا کیا ہوگا؟ کیا کریں گے! وقیر وہ وقیر۔

جب کہ لڑکے کی پیدائش کے تو تصور سے ہی خوشی کے بیڑا بجے جتے لگتے ہیں۔ حضرت انسان سرتوں کے ساتویں آسمان سے چمٹا خوش آئند مستقبل کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ امیدوں اور ارمانوں کی ایک نئی دنیا کی آبیاری ہونے لگتی ہے۔ باپ ہو خواہ ماں خوشی کے اس عظیم موقع پر ایک جیسے ہی احساس سے غلوب ہوتے ہیں حالاں کہ یہ خوشی جمولی میں ڈالنا یا نہ ڈالنا سراسر اُس قدرت والے کے اختیار میں ہوتا ہے جو جزا و سزا کا مالک و مختار ہے۔

اماں بی کی جہالت اور اعلا سوسائٹی جو اُن نہ کرنے کی فرسودہ عادات و فطرت سے قطع نظر ابو کو ہمیشہ ان سے یہی شکوہ رہا کہ وہ ازدواجی زندگی کے چھ برسوں میں انہیں ایک بیٹے کی خوشی نہ دے سکی تھیں گویا کہ یہ اللہ معاف کرے ان بے چاری کے اختیار میں تھا کہ وہ ان کو بیٹے کے وجود سے محروم رکھے ہوئے تھیں۔ اب کوئی اُن سے پوچھتا کہ بھئی! اگر یہ امر خود اختیار ہی ہے تو پھر تم خود کیوں نہیں ایک عدد بیٹا بنا لیتے! آخر کو شوق اور ارمان تو تمہارا بھی ہے بیٹے کا باپ کہلانے کا لیکن اب اس کو کیا کیا جانے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے معاملات میں قصور و اعموماً عورت کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا الزام بڑی سہولت اور بے رحمی کے ساتھ عورت

اچانک ہی وہ رانی کو لینے آگئے وہ حیران رہ گئی اسے یاد آ گیا کہ وہ ایک عدد ماں بنی بھی ہے یہ مقدس و محترم ہستی کہیں نہ کہیں موجود ہے جو دن رات کے ہر لمحے اور گھڑی میں اس کی راہ نکلتی رہتی ہے۔ حیران وہ اس تبدیلی پر بھی تھی کہ اُس نے ابو کو یہ ایسا خوش پر جوش اور مگن نہیں دیکھا تھا اور اس بے پناہ خوشی اور سرسستی کا رہا چلنے جا کر نکلا۔

اجلی اجلی مسکراہٹوں والی نرس نے کمر میں لپٹا ہوا مناسا گلابی گلابی راجا کا اُس کے سامنے کر دیا۔ مل بھر میں وہ اپنے چابی سے چلنے والے سارے قیمتی کھلوے بھول بیٹھی۔

لیکن سفید پڑتی بی اماں کو شاید راجا بھینسا سے بھی زیادہ خوشی اُس سے مل کر ہو رہی تھی۔ بیڈ پر لیٹے ہی لیٹے انہوں نے اپنے تمام دکھ بھلا کر اُسے کلیجے سے لپٹا لیا۔ چلا ہوئی پیاسی آنکھوں سے قطرہ قطرہ خون جگر یوں جھر جھر چکا کہ ابو نے بے سادہ دھیرے دھیرے ندامت اور پشیمانی کے کسی شدید احساس سے مغلوب ہو کر دونوں ہاتھ اماں بی کے شانوں پر رکھ دیے۔

وہ تینوں کے تینوں آپس کے سچے رشتے کو پہچان کر کیسے آپس میں مل بیٹھے تھے ساری رنجشیں ساری کدورتیں اور سارے اختلافات اک نچھے سے وجود نے آ کر مٹا ڈالے تھے۔ ابو کے تو گویا مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے۔ انہیں بیٹا ہونے کا دکھ بھی تو کتنا تھا۔ اس ایک محرومی نے انہیں کیسا چنچڑا اور اماں بی کے وجود سے بے نیاز اور بے پروا کر رکھا تھا حالاں کہ اس میں اماں بی بے چاری کا کیا دخل تھا قدرت کے سامنے جیسے یہ بے بس تھے اسی طرح وہ بھی مجبور تھیں۔

بہارِ تعلیم یافتہ ہونے اور روشن خیالی کے باوجود تھے تو آخر محرومی نا۔ شادی کے بعد جس کی سب سے بڑی خواہش ایک عورت بننے کی تھی۔ زائد جادو وارث کے زوہ

بہت مطمئن اور خوش تھیں مگر ابو بھلا اتنی بڑی تبدیلی کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔
مگر وہ تھی کہ بکھری جاتی تھی تب بہ مشکل تام بھد مشت ابونے اُسے ہنسنے کے
لئے کھڑا کرتے رہنے کے بچے وعدے کر کے منایا۔ سو سو خوشامدیں کہیں تو وہ واپس
انے پر آمادہ ہوئی۔ اماں بی نے اس وعدے کو ہی قیمت جانا کہ چلو کم از کم کم ایک
لکھ نو نوئی اور کچھ نہیں تو ہر ایک اینڈ پر اپنی بچی سے مل لیا کریں گی۔ پہلے والی پابندی
تو جان چھوٹی تھی ماں بیٹی کی۔

بڑا ہی یادگار اور دل دروہ میں چھپ جانے والا دن تھا وہ!

راتی کے پہلے سال کے امتحانات ختم ہونے میں ابھی ایک روز باقی تھا کہ
پاکستان ہی ابو کے بجائے ان کا ڈرائیور لیٹے آ پہنچا۔ پرنسپل سے چائے کیا بات ہوئی کیا
الان۔ بہر حال اُسے امتحان ہال سے اٹھا کر فوری طور سے گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

اُسے پیپر نہ دینے کا لمحے بھر کو بھی افسوس نہ ہوا۔

گھر جانے سے زیادہ اُسے راجا بھٹیا سے ملنے اُسے دیکھنے اور پیار کرنے کی تمنا
انے کی خوشی تھی۔

اپنے سارے کھلونوں سے بھرا بیگ لیے خوشی خوشی اچھلتی کودتی کھر میں داخل
ہوا۔ ماں کے بجائے وہ پکار بھی بھائی کو رہی تھی۔ جیسے وہ جہاں کہیں بھی ہو گا اُس کی
درازا باب دے گا یا بھاگ کر اُس سے لپٹ جائے گا۔

راجا بھٹیا ویسے ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر ہوٹل گئی تھی ویسا ہی گورا چٹا مسکراتا ہوا مگر
اب اس نے جس جس کر بھانے کے بجائے اُسے سے آنکھیں موندے کوئی نرمالی ہی نہند یا سو
الان۔ ایسی ظالم اور ابدی نیند جسے اماں بی کی سسکیاں آدھ زاری اور راتی کی چیخیں بھی
نہیں کہیں۔ معمولی سا طغوان سے ہنستے مسکراتے زندہ لوگوں کے درمیان سے بڑی بے
دلی کے ساتھ اٹھا لے گیا تھا۔ ہنستے بھر پیار رہنے کے بعد وہ ہوٹل واپس لوٹی تو اُس

کے کھاتے میں ڈال کر مردہ کی الذمہ ہو جاتا ہے یہ طرز فکر صدیوں کا سفر طے کر۔
ہوئے موجودہ دور میں بھی جگہ جگہ نظر آ جاتا ہے۔ شاید وادری بھی کبھی کسی نے اس۔
خلاف آواز اٹھائی ہو تو اٹھائی ہو۔

من موبنے بیٹے کی پیاری صورت دیکھ کر ابو نے سارے گلے اور شکایتیں ختم
ڈالیں تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی انہوں نے اپنی زندگی کے دیگر معمولات اور
بچاتے ہنگامے نظر انداز کر کے اماں بی کی اس قدر دل جوئی کی اتنی دل جوئی کہ
گزشتہ تمام زیادتیوں اور بھول کی کسر نکال دی۔

اماں بی کو شاہراہ حیات کا یہ دور خواب سا لگتا۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے اب
دم آن کے سر پر سرخاب کے پر اگ آئے ہوں۔

”یا اللہ! میں ایسی معتبر ہو گئی!“ بے چاری حیران ہو ہو کر سوچتیں۔ ”کیا ج
میں پہلی مرتبہ ماں بی اور رانی میری گود میں آئی تو اُس وقت میرے پاؤں تلے جا
نہیں تھی! کیا لڑکے اور لڑکی کا اتنا فرق ہوا کرتا ہے! کیا لڑکیوں کو جہنم دیتے در
ماںیں سر مرتبہ مرنے اور جیتنے نہیں ہیں!“

گو کہ رانی کی پیدائش پر بھی انہوں نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا تھا ہار
ایسی بے پایاں مسرت بھی ظاہر نہ کی تھی جو راجا بھٹیا کو پا کر از خود پھوٹی پڑتی تھی۔

خود رانی کا دل راجا بھٹیا سے ایسا لگا کہ اُسے ہوٹل جانا بھی نہ بھایا۔ وہ تھا بچہ
بہت نرم و نازک اور بھولا معصوم اور خوب صورت بالکل ابوی تصویر لگتا۔ وہی ختم کھا
ہوئے سنہری بال سرخ و سپید رنگت اور چوڑی و فراخ پیشانی۔

وہ اس بیٹے جانتے گزے سے جدا ہونے کو کسی صورت تیار نہ تھی سارا سارا
اس کی کوٹ سے لٹکی رہتی۔ نہ کھانے پینے کی پرواہ رہی تھی نہ لکھنے پڑھنے کی۔ سا
دوستوں اور ہوٹل کے معمولات کو یک سر بھول بیٹھی تھی۔ اماں بی اس صورت

نے اپنے کھلونے جن سے کھیلنا بہت دنوں سے ترک کر دیا تھا، احتیاط کے ساتھ پونچھ کر دوبارہ شوکیس میں سجالیے۔ مناسباً دل جو بے طرح ٹوٹ چکا تھا دوبارہ کے ماحول میں ضم ہوتا چلا گیا۔

ابو نے اب تک ویک اینڈ والی پابندی ہٹا رکھی تھی یا پھر شاید وہ اس سانچے کے باغیچے سے ایسے دبے تھے کہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ بہر کیف کبھی ڈرائیور کبھی خود چاکرانی کو گھر لے آتے مگر اب پہلے والی بات ہی نہ رہ گئی تھی۔ اماں بی! خوب پیار کرتیں سو سو طرح اس کے لاڈ اٹھاتیں اچھے اچھے کھانے پکا کر اُسے کھا پکا کر اُسے کھلانے کی کوشش کرتیں پھر اپنے آنسو پھپھپا کر اُسے رخصت کر دیجئے اتنے عرصے میں وہ کتنی بدل سی گئی تھیں۔ پہلے سے زیادہ کم زور اور اپنی ام سے کہیں زیادہ دکھائی دیتیں۔ انہیں بھی بیٹے کی مفارقت کا صدمہ ابو سے کم نہ تھا شاید زیادہ ہی ہو مگر ابو کا رویہ اللہ! مان..... خدا کی پناہ! انہوں نے ایک سردی بنے اور حنا پھونتا بنا لیا تھا۔ دل اور نگاہ کو بیک وقت اذیت میں مبتلا کر دینے والی ایسی حسی جسے بس اماں بی جیسی ہی صاحبہ بیوی برداشت کیے ہوئے تھی ورنہ کوئی مٹی! عورت ہوتی تو چیخ اٹھتی۔ اب تو وہ رانی سے بھی خاصی حد تک غافل رہنے لگے۔ پہلے کی طرح اُس کی دل چسپیوں میں شریک ہوتے اور نہ گھمانے پھرانے لے۔ تھے۔ ڈیوٹی کے بعد سارا دن لائبریری میں جانے کیا کچھ پڑھا کرتے۔ ایک نڈھ خاموشی اور بوجھل سانسنا اور دو دیوار پر چھایا ہوا ہوتا۔ بوند بھرے کادن گزرنے میں آ نہ کالی سیاہ طویل راتیں سمٹنے میں آتیں۔ عجیب وحشت زدہ دور تھا۔



رانی خوب بور ہو کر ہوٹل آتی تو اگلے ہفتے گھر جانے کو جی نہ چاہتا۔ اُس کا ننھا لکھن اپنے ارد گرد کے ماحول پر سایہ قلعن بے سکونی اور بے حسی کا غلبہ اُلٹ کر اُلٹ کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا اور کچھ بھی نہ سمجھ سکتے کی بنا پر الجھ الجھ کر رہ جاتا۔ اُس بار اسی عقل میں یہ قصہ نہیں آتا تھا کہ ایک رعبہ بھینا کے آ جانے سے گھر کے اندر آگئی۔ بے تحاشہ رونق اور گہما گہمی کیوں سما گئی تھی اور اب چلے جانے پر قبرستان کا سا لاکھوں طاری ہو گیا!!

وہ سکس کلاس میں تھی تو تب پھر ان کے گھر میں ایک ننھے نئے فرد کا اضافہ ہوا مگر اس بار یہ فرق تھا کہ ابو اُسے خوشی خوشی ہاسٹل سے لے کر نہیں گئے تھے نہ ہی اُسے لی میں کسی طرح کی اطلاع تھی بلکہ وہ خود ہی چھٹی کے دن ڈرائیور کے ہمراہ گھر آئے ہمارے ان کے اُس پیارے مہمان سے متعارف ہوئی۔

اُسے صرف اماں بی ہی خوش خوش اور گن نظر آئیں۔ ابو کے چہرے پر آسودگی کا اولیٰ ترین نشان تک نہ ملتا تھا۔ نہ ہی انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار ضروری سمجھا تھا۔

اماں بی نے از خود اُسے ”شرمین بیٹی“ کہنا شروع کر دیا۔

مگر اس دفعہ رانی نے بھی حیرت انگیز طور سے کوئی توجہ نہ دی۔

دن دونوں کے درمیان فاصلے بڑھاتے جا رہے تھے۔ بلا آخر یہ مسلسل بڑھنے والا فاصلہ ایک ناقابل عبور غلج کی طرح ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ہمیش کے لیے حائل ہو گیا۔ لہٰذا کو بڑھتی ہوئی بیٹیوں کو خیال آیا نہ اماں بی کی بے چارگی پر رحم وہ بے حد کہوت اور انتہائی بے حسی کے ساتھ ہی کر گزرے جو شاید شروع سے ہی اپنے دل و دماغ میں ٹھان چکے تھے۔ شاید درمیان کے سارے ماہ و سال وہ کسی جینی یا روحانی لٹکٹس کا شکار رہے ہوں ورنہ باقی تو سب کچھ انہوں نے بہت نازل انداز میں کیا۔

رانی میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہو کر طویل رخصت پر گھر آئی ہوئی تھی اب وہ دھماکا ہوا۔

اس کی موجودگی بھی قیمت ہی تھی ورنہ جانے اکیلی لٹاں بی کا کیا حال ہوتا! انہوں نے جانے کس حوصلے سے یہ ایسے برداشت کیا تھا! وہ تو ابو کی خوابگاہ میں کھڑی کھڑی بزدلوں کی طرح رونے لگی تھی۔ یوں بھی کوئی جیتے جی انہوں سے من موڑتا ہے۔ جیسے زندہ ہوتے ہوئے مر گیا ہوا!

اللہ ہی جانے ابو کو یہ کیا سوچھی تھی!

ان کی نئی بیوی رانی سے بہ مشکل چند برس ہی بڑی ہوئی۔ بہت طرہ دار حسین اور ابو کی توقعات کے عین مطابق انہوں نے بلا خرابی ہی کر ڈالی تھی۔ غراتے امانڈے سیلاب کے آگے کون بند باندھ سکا ہے! جو ایسی بے لگی کوشش کرنے خود بھی فخر سے میں پڑے۔ سیلاب کا بہاؤ آتے بھی ساتھ بہا لے جائے۔ اماں بی کے حوصلے آہستہ آہستہ کم ہوتے گئے اور وہ ایسے کچے گھر کی مانند ڈھنسی چلی گئیں جس کی بنیادوں سے اچانک پانی اٹل پڑا ہو۔ زندگی سے بہت بڑا دھوکا کھایا تھا انہوں نے۔

زودھو کر رانی نے سکھ کر گھر اسانس لیا۔

بہت بچپن سے اور پھر شعور کے بیدار ہوتے ہی آتی جاتی سانسوں کے درمیان

دراصل رجب بھیا کے بعد سے اسے ہنسنے کھلکھلاتے زندہ کھلونوں سے ڈر آ تھا کہ جانے کب چپکے سے سفید سفید کپڑے پہن کر دوسروں کے ساتھ چل پڑے وہ پہلے کی طرح روتی جھکتی اکیلی رہ جائے۔ بنا پیار کیے اور "ٹانا" کہے بغیر نہ جانے کو وہ بہت بڑی بدتمیزی خیال کرتی تھی..... اسے تو مس ڈیسوزا نے ابتدائی ہی یہ دیا تھا کہ ہر اچھے بچے کو "ہیلو" اور "ہائے" کہنے کا سلیقہ اور شعور ضرور آنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے "شرمین" کے ساتھ دوستی نہیں کی اور اگلے دن ضد کے بغیر ہی چلی گئی۔ گھر میں اس کا کسی نہ بہلا۔

ویک اینڈ پر پھر گھر آئی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ شرم طرح ہاتھ پاؤں مار مار کر کھیل رہی تھی۔ اسے خوش باش دیکھ کر اس کا دل مطمئن پھر تو..... بہت سارے دن گزرتے گئے..... گزرتے گئے لیکن شرمین نے رانی بدتمیزی نہیں کی اور نہ ہی سفید کپڑے پہن کر دوسروں کے ساتھ کہیں گئی بلکہ لحد ہر پل ماں کے ساتھ ساتھ رہنا پسند کرتی تھی۔ اس طرح رانی بھی رفتہ رفتہ آ مانوس ہوتی چلی گئی۔ دونوں کے درمیان دوستی کا ایک پیارا سا تعلق پیدا ہوتا گیا جوں جوں رانی بڑی ہو رہی تھی یہ بات شدت سے اس کے ذہن۔

چپکتی جا رہی تھی کہ ابو گھر اور گھر کے کینوں سے بہت ڈور ہوتے جا رہے تھے بیرونی مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ہفتے وار چھٹی پر بھی وہ شاز و تار ہی گھر دیتے۔ وہ ہفتوں ان کی صورت کو ترستی۔ مہر شکر کے ساتھ ڈرائیور کے ہمراہ چپ چاپ ہوٹل چلی جاتی۔

اماں بی نے گویا مہر و تحمل کی چادر اوڑھ لی تھی۔ تمام حالات پر چپ تھی۔ ان کی مسلسل خاموشیاں مزید رنگ لارہی تھیں اور وہ شیر ہوئے جا رہے انہوں نے بیوی کی خاطر خود کو بدلا تھا نہ بیوی نے ان کی راہ اپنائی تھی۔ ہر آ

کہیں اندر ہی اندر چھپنے والا کانٹا اس سانچے سے جیسے نکل گیا تھا۔ چلو بچپن سے ہی کم کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کا ڈرامہ پسین تو ہوا۔ جی ہر وقت کسی انجانے خدشے سے گھٹا گھٹا رہتا تھا۔ اُس جان لیوا عذاب سے جان تو چھوٹی۔ اُس نے بہت ہلکی پھلکی ہو کر یہ سب سوچا تھا۔

ایسا بی پشہر میں پرورد یکھنے سننے والوں پر جو گزری سو گزری مگر رانی توجہ کا
 ہی بہت پر سکون ہو گئی تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت اُس کا انٹرکارڈ لٹ تھا۔

میٹرک میں محض سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے والی نے اس بار صوبے بھر میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی تھی۔ شام کے اخبار میں اس کی تصویر اور چھوٹا سا انٹرویو "مستقبل کی ڈاکٹر" کے عنوان سے چھپا تھا۔

وہ سارا دن آنسو ضبط کر کے آنے جانے والوں سے میاں کبادیں وصول کرتا رہی۔ کئی ایک ٹیلی فون بھی آئے۔

”آہ! ایسے بے آسرا تو قیم بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ جیسے ہم ہیں۔ پتا نہیں ایسے خوشیوں کے موقع پر اپنے دو پیارے رشتے کیوں یاد آ جاتے ہیں جو دراصل اپنے نہیں ہوتے۔“ سارا دن مصروف رہنے کے باوجود وہ دن بھر ایسی ہی باتیں سوچتی کرتی رہی۔ مگر ماں اور چھوٹی بہن کے سامنے آہ تک لیوں پر نہ آنے دی۔ اشکوں کی برسات اندر ہی اندر اتارتی رہی۔

شام گہری پڑ چکی تھی۔ ہر طرف برفی قفقے جھلکا اٹھے تھے۔ تب اچانک ہی الجھن
تو آگیا۔

دوسری طرف ان کی نرم نرم دل کی گہرائیوں کو سمجھ جانے والی ساحر آواز اُسے ایک دم آپ سین کر گئی۔

ابو جیسے بہت قریب ہو کر بڑے ڈالار سے کہہ رہے تھے۔ "رانی بیٹے! آپ نے اتنی شان دار اور عظیم کامیابی حاصل کی ہے جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گندہ دری گندہ بیٹے آپ نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ آپ نے میری بہت بڑی اور اہم ترین خواہش پوری کی ہے۔ مجھے کتنا شوق تھا آپ کو ڈاکٹر دیکھنے کا! آپ کو اب یقیناً

”بیٹو۔۔۔ ابو۔۔۔ جی ہاں۔ مسیحی ہوں۔۔۔ رانی۔۔۔“ ہاں جو ضبط کے اس

میڈیکل جوائن کرنا ہے۔ یہ بتائیے آپ کو کیا تھ چاہیے انعام میں اپنے ابو سے؟“ وہ اسنے یقین اور بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ باتیں کر رہے تھے کہ لمحہ بھر کو راز لڑکھڑائی گئی۔ وہ بہت حوصلے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ خوب جانتی تھی کہ باپ اُس سے کس قدر محبت رکھتے ہیں۔ اُسے ڈاکٹر دیکھنے کی دیرینہ تمنا تھی ان کو! لمحہ بھر کے وقفے میں اس کا ذہن قلابازیاں کھاتا ہوا کہیں سے کہیں جا پہنچا بچپن سے اب تک کے واقعات متحرک فلم کی مانند لگا ہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ اماں بی کا سفید ڈوپٹے کے بالے میں موگوار مسکراہٹ والا چہرہ اور سونی کلاسیاں جیسے اس کے سامنے لہر لہرا کر انصاف کا تقاضا کرنے لگیں۔

دل جیسے کپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ شاید فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ کسی نے اس کا ساعت میں ہر گوشی کی۔ بل کے پل منتشر دماغ نے سوچا۔ ہائے یہ مردوں کی خود غرض مطلب پرست فطرت! ہر دفعہ ہر جگہ اپنی ہی خواہشات اور آرزوؤں کو مقدم رکھنے والا قوم!! کہیں بیوی پر حکم چلاتے نظر آتے ہیں تو کبھی اولاد کو سرنگوں کر کے خوش ہوئے ہیں۔ کتنے بے شمار روپ اور کتنے سارے چہرے ہوتے ہیں فقط ایک مرد کے! ایک طرف محبوب سے کہتا ہے۔ ”میں غیر شادی شدہ ہوں ابھی تو مجھے اپنی پسند شادی رچانی ہے۔“

دوسری طرف بیوی کو یقین دہانی کراتا رہتا ہے کہ ”تم میری زندگی میں شامل ہونے والی پہلی اور آخری عورت ہو۔“

”رانی کے دل و دماغ کے درپچوں سے ایک شدید نوعیت کا طوفان ٹکرا کر گزر چکا تو وہ اپنی زندگی بھر کا تازک اور اہم ترین فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسا فیصلہ جو ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ اُس نے اپنی دلی خواہش اور ذاتی تمنا کو مٹا کر اپنی ساری محنت اور دماغی کاوش فناک میں ملا کر صرف ابو کے غرور کو شکست دینے کی خاطر وہ فیصلہ کیا تھا جس کا اظہار

کرتے وقت اس کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔ سینے میں درد کی اتنی زبردست اور شدید لہر اٹھی کہ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی مگر کیا خیال ہے کہ لہجے اور آواز میں لرزش پیدا ہوئی جو اسے چتر کی طرح ٹھوس اور بے پلک لہجے میں بولی۔ ”اقسوس ابو کہ میں آپ کی یہ اہم ترین خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ مجھے میڈیکل جوائن کرنے کا قطعی شوق نہیں ہے۔ میں اب تعلیم کا سلسلہ ختم کر رہی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کے بجائے ایک معمولی ٹیچر بننا زیادہ پسند ہے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں خود کو آپ کے قیمتی تحائف کے لائق بھی نہیں سمجھتی۔ اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔“

پھر تو ٹیلی فون کا لڑکا گویا تاننا بندھ گیا۔

دن دیکھا جاتا نہ رات۔ دو پہر کا سہ ہوتا یا سیرے سویرے۔ ابو کو کسی پل چین نہ تھا۔ وہ برابر فون پر فون کرتے۔ رانی کو سمجھا سمجھا کر عاجز ہو گئے مگر وہ اپنے فیصلے پر چٹان کی مانند ڈٹی رہی۔ اُسے کوئی موقف اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات سے منحرف نہ کر سکا۔ وہ ان کو شکست دینے پر تکی بیٹھی تھی۔ ابو کی پریشانی حد سے بڑھ گئی۔

آخر میڈیکل انٹرویوز کی تاریخ نکلی جا رہی تھی۔ ادھر لڑکی ہتھے سے اکھڑی جا رہی تھی۔

اُن کی سمجھ میں یہی سبب آسکا کہ لڑکی کوماں ان کے خلاف درغلا رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا! اُن کے عتاب کو آواز دینے کے لیے یہ تصور ہی کافی تھا۔ اماں بی کی بھلا اُن کے سامنے کیا حیثیت تھی۔ ایک روز پکار بیٹھے ان کو فون پر۔ پھر تو وہ سنائی ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ ان بے چاری کو بے نقط صلواتیں سنا ڈالیں۔ دھمکیاں۔۔۔ پھٹکار۔۔۔ ڈانٹ۔۔۔ اُن سے جواب تک نہ بن پڑا۔

باہر چاند کے بغیر رات آجیں بھر رہی تھی اندر رانی اور اماں بی سنگ رہی تھیں۔ امید کی ایک کرن بھی نہ تھی جو ماہوسی کے گھورا اندھیروں کا دیا بن جاتی۔ زندگی ایک بار پھر تمام تر قہر کے ساتھ چلا بدل کر راہ میں آن کھڑی ہوئی۔ وہ بار بار سوچتی۔
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے!
آتی جاتی سانس الزام لگ رہی تھیں۔ زندگی نہ ہوئی اک تماشا ہو گئی۔

اُس نے جھنجھلا کر سوچا۔ ”اِن ابو صاحب نے تو زندگی اجیرن کر دی۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ انہیں اماں سے کوئی دلی عداوت ہے۔ کوئی ایسی دشمنی ہے جس کی چڑھی چڑ میں وہ ہر معاملے میں انتہائی اقدام کر کے اپنی رُوح کو خوش کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ سچے کبھے بغیر کہ اُن کا کیا قصور ہے؟ اُن کا سب سے بڑا جرم یہی ہے تاکہ وہ ایک بچہ اور لاچار ماں ہیں اور وہ ان کے خلاف کسی بھی طرح کی کارروائی نہ کرتی تھیں۔۔۔۔۔ اُن کی مسلسل خاموشی اور چپ نے ابو کو شیر بنا دیا تھا۔ حق دار جب خود ہی اپنے حق سے دستبردار ہونے پر تیار ہو جاتے تو ظاہر ہے اُس کی جھولی میں بار کے سوا اور کیا آ سکتا ہے؟ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔۔۔۔۔“

غم و غصے کی تیز لہر نے رانی کو چاروں طرف سے نئی طرح جکڑ رکھا تھا۔ تب بہت بیزار ہو کر بڑبڑاتی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ وقت پر میری مکو پڑی میں جو مائی دہی کر گزروں گی۔“ سویرے رانی بیدار ہو تو اماں بی نماز اور تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد اُس کی چیزیں اٹھا اٹھا کر ایک بڑے ٹائچی میں ڈالتی جاری تھیں اور آنکھیں پونچھتی جاری تھیں۔

اُس کی نگاہوں میں بے اختیار بچپن کا وہ منامنا سا لیکن ایک ناقابل فراموش دامن لاسا واقعہ گھوم گیا جب اُسے کاتوینٹ کے ہوٹل میں بھیجا جا رہا تھا۔

جب جی بھر کے دل کی بھڑاس نکال چکے تو جینی کونون پر بلایا اور تمہید کے بغیر دوسرا حکم لگا دیا۔

”بیٹے! مجھے تمہاری ہر خواہش عزیز ہے۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔۔۔۔۔ مت میڈیکل لائن جوائن کرو مگر۔۔۔۔۔ تمہیں سروس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بس تم کل صبح تیار رہنا۔ وہاں اب تمہیں ایک دن بھی نہیں رہنا ہے۔ میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ تمہاری والدہ کے من بہلاوے کو شرمین کافی ہے۔ تم اب میرے پاس رہو گی۔ یہیں پڑھنا۔ جو ب جیکٹ چاہنا“ لے کر فارن چلی جانا میں تمہاری ہیلپ کروں گا۔ سویرے تیار رہنا او کے!“

رانی ان کی بات پوری طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔

پوری رات شدید قسم کی کشمکش میں جیتی۔

اماں بی کو ابو کا یہ نیا حکم سنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان کی اُتری صورت اور سہا سہا اُماز اس نئے ستم سے آگاہی کی چٹلی کھا رہا تھا۔ اُس کو پار دیکھتی تھیں اور نظریں ہٹا لیتی تھیں۔ کچھ کہنے کو ہوش کہتے کہتے ڈک جاتیں۔

شرمین ہر بات سے بے خبر پڑی سو رہی تھی مگر یہ دو ماں بیٹی اپنے اپنے مقام پر ایک ہی سوچ اور ایک ہی خوف سے لرزتی رہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ کہہ سُن لیتیں تو دل کی بھڑاس نکل جاتی۔ شاید چلتے چلتے احساسات کی تڑپ میں کمی آ جاتی لیکن وہ تو ایک دوسرے سے چپ چاپ کر جاتیں رہیں۔ جاگ جاگ کر سکتی رہیں۔ ستر پر تو پیسے کانٹوں کی فصل آگ آئی تھی۔ کسی کروٹ قرار نہ تھا۔ کسی پہلو جھین نہ تھا۔ ایسی رات جس کا ہر لٹکے کرب میں ڈوبا ہوا تھا۔ سنے میں انکھوں کی بارات اُتری ہوئی تھی مگر آنکھوں کی دلیز پار کرنے پر پابندی تھی۔

رات سے چلتے جھلتے جذبات پر بے پناہ غم و غصہ ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ ایک شخص کے ناروا سلوک نے اُس کی ماں کو جاڑ رکھا تھا۔ اُسے اپنا وجود بے حد سدا آندھیوں کی زد پر آجانے والے ایک بے بس اور مجبور دیے کی مانند لگ رہا تھا۔

”بیٹے! سنا نہیں آپ نے؟“ ابو نے بڑی ملاحت اور شفقت سے اُس کے گلا جھپٹائے۔

رانی کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ایک شدید قسم کے جھٹکے سے بیدار ہو گئی اور تو سے چپٹی۔ ”نہیں ابو..... میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ کسی قیمت پر نہیں۔ میں آپ کو پسند نہیں کرتی..... آپ میرے ابو نہیں ہیں۔“

ابو دھیرے سے فحش پڑے۔ ”ارے بیٹا! ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ بھی دن دھاڑے..... ایس!“ انہوں نے چاروں انچیلوں کی طرف اشارہ کیا۔

”سامان تو سارا تیار رکھا ہے آپ کا!“

رانی نے بے مشکل اپنے بے قابو سانس اور کانپتے ہاتھ بیروں کو کنٹرول میں کیا۔ بہت قفل سے بولی۔ ”جی ہاں..... بے شک سب سامان تیار ہے اور آپ پہنچیں۔ جا بھی سکتے ہیں۔ یہ چاروں سوٹ کس آپ کی عنایت کر دہ چیزوں سے بھرے ہو۔ ہیں لیکن آئندہ ہمیں آپ کی ایک پائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم نے ممبر کر جان لیا ہے۔ میں اب ملازمت کر کے اپنی والدہ اور بہن کا پیٹ پال سکتی ہوں۔ آم اپنی دنیا میں واپس چلے جائیے۔ ہمارے اور آپ کے راستے یقیناً الگ الگ ہیں۔ نے اکیلے رہنا سیکھ لیا ہے۔ تنہائیاں کسی کو کھا نہیں لیتیں۔ دیکھ لیا آپ نے ہم تنہا ہی زندہ ہیں نا! کیوں کہ ہم آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے تو ہم بھی..... آپ ذات سے بے نیاز ہیں۔ مجھے خیرات کے طور پر ملنے والے عیش و آرام کی قطع ضرورت نہیں۔ اب میرا مقصد حیات میری والدہ اور میری پھوٹی بہن ہیں۔ میں۔

تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم وہ حاصل کرتے ہیں جن کے باپ..... زندہ ہوتے ہیں..... ہم تو بہت پہلے ہی ختم ہو چکے ہیں!“

ابو دھک رہ گئے۔ حیرت اور دکھ کی زیادتی سے سُن ہو گئے۔

بیٹی کا ایک ایک لفظ زہر میں بچھے ہوئے تیر کی مانند دل پر جا جا کر لگا۔ اُس نے نکال نہ بھی تو ٹھیک ٹھیک لیا تھا۔

وہ درو سے غم حال ہلہلا کر چلائے۔ ”یہ کیا اول قول بک رہی ہو! ہوش میں نہیں ہو کیا؟“ لیکن آج تو رانی کچ کچ بے قابو ہو چکی تھی۔ ہوش و خرد سے بریگانی۔ دل کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا گرم گرم لہلاؤ ایک ہی ٹھیس سے بہہ نکلا۔ پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگا۔

اس وقت اُس پر وہ جنونی کیفیت طاری تھی جس میں ڈوب کر حجاب اور ادب و لٹا کے تمام پردے چاک ہو جاتے ہیں۔ مظلومیت سراپا فریاد بن کر اٹھتی ہے اور راہ میں حائل ہر رکاوٹ اور بندش کو توڑ کر سر اپنا غضب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ان لمحات میں وہ اپنے آپ میں کب تھی! اُسی کیفیت میں بولی۔ ”جو کچھ آپ نے سنا وہ ایک تلخ حقیقت ہے ابو! یہ سارے رشتے ناٹے آپ نے خود توڑے ہیں..... خود منقطع کیے ہیں۔ کسی دوسرے کا دخل نہیں ہے اس میں۔“

ابو کی ذہنی رو ایک دم بہک گئی وہ اماں بی کی طرف دیکھ کر غرائے۔ ”یہ سب تمہاری چار سوٹیں ہی ہے قیصر جہاں..... میں خوب اچھے طریقے سے سمجھ رہا ہوں تمہاری کارستانی اور۔“

”ابو!.....“ رانی دونوں کے درمیان آن کھڑی ہوئی۔ ”اماں بی پر کوئی الزام لگانے سے قبل سوچ لیجئے کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں! الکی بے جا بہتان بازی کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں اب باشعور اور سمجھ دار ہوں۔ اپنے لیے جہاں مناسب سمجھوں گی رہوں گی۔ قانوناً بھی اپنی مرضی کی مالک و مختار ہوں۔ ہم پر آپ کی ابارہ

داری اب ختم ہوئی۔ وہ وقت گیا جب آپ اماں بی بی پر قسم کا ستم روا رکھتے تھے۔ آپ سے ہمارے آپ کے رہے سبے رابطے بھی ختم ہوئے۔ آپ کا مجھ پر اور میرا آپ پر کون سا حق نہیں..... آپ جاسکتے ہیں سارے رشتے سارے تعلق تو ذکر۔ دراصل! آپ خود بھی یہی چاہتے ہیں!“

اماں بی بی لرزاتے جسم اور کاہتے قدموں سے آگے بڑھیں اور ایک زوردار چلا اس کے گال پر جڑ دیا۔

”بد تہذیب..... بد زبان..... بے حیا!!! الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی زبان سے آئے۔ پھر وہ مڑی طرح ہانپتی ہوئی وہیں قالین پر بیٹھ گئیں۔ ابو سنانے میں آگئے۔

زندگی میں پہلی بار اتنے بدحواس ہوئے کہ سگار ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا چہرے پر زردی سی آگئی۔ پھر..... روتی ہوئی رانی پر ایک نگاہ ڈالی سگار اٹھایا اور ڈنگا تے قدموں سے باہر نکلے چلے گئے۔

رانی نے روتے روتے نیچے جھک کر اماں بی بی کو ہانپوں کے حصار میں بھر لیا۔ بلک بلک کر کہنے لگی: ”اماں بی بی..... میری اماں بی بی! میں نے ابو کو چھوڑ دیا۔ ہمیشہ لیے چھوڑ دیا..... وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ میری زندگی تو آپ اور شرمین ہیں۔ باقی میں کسی کو نہیں جانتی۔ ابو پتھر دل اور بے حس ہیز آپ مجھ سے خفا نہ ہوں..... ورنہ میری زندگی میں کیا باقی بچے گا! جتنا جی چاہے لیجئے..... مار مار کر میرا دم نکال دیجئے لیکن..... مجھ سے روٹھئے مت۔ مجھ میں اس حوصلہ نہیں ہے کہ آپ کی فحش برداشت کر سکوں۔ وہ تھا ہو گئے انہیں خوار بنے دیں ہم سے خوش ہی کب تھے؟“

دونوں ایک دوسرے سے چٹنی زار و تھار رو رہی تھیں۔ خبر نہیں پچھڑ کر مل گئی تھیں پچھڑ کر ملی تھیں!!



آہستہ آہستہ زمانے کے سرد و گرم میں چار سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ وقت نے کئی کروٹیں بدل تھیں۔

رانی کبھی چار برس پہلے کے واقعات سلسلے وار یاد کرتی تو اسے اپنے حوصلے اور بے پناہ جراتوں پر تعجب ہوتا تھا۔ اُس نے کس پامردی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ماں پر محیط صبر آزمائی کاٹی تھی یوں جیسے کوئی پل پل سانس کی راہ منجھڑا تار رہا ہو۔ اسی دل کی رگ دگ سے لہو کی رستی ہوئی بوندوں نے اُس کی خود داری کو مجروح کیا تھا۔ اس نے لمحے لمحے کی موت کے بعد فحش فحش کر جینا سیکھا تھا اور اس آزمائش میں اسباب بھی تھی۔

اپنے دکھوں پر دل نواز مسکراہٹوں کے پردے ڈالنا تو جی بھر کر رو لینے سے زیادہ فحش اور جان جو کھوں کا کام ہوتا ہے۔ اُس کے مختصر سے نازک، کوئل اور کم زور سے پر ابو کی ضد اور اماں بی بی کی مستقل مزاجی ختم تھی۔ درحقیقت وہ وہ متضاد شخصیتوں کا مرکب تھی۔ مستقل مزاج اور نرم خوی تو ساتھ ہی ضد کی پکی اور اپنی زبان کی کھری بھی

اماں بی بی کی زندگی سے اُس نے بہت بڑی نصیحت لی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ

ہاکی طرح سمجھانے لگیں۔

”چندا— میری لعل— زندگی بھو— یوں ہی اوپر اوپر سے دیکھ کر مت ڈارو۔ یہ دنیا بہت ستم گر اور ظالم چیز ہے۔ یہاں کسی کہتے کی زبان نہیں پکڑی جا تی۔ بات کا بنگلہ بنتے دیر نہیں لگا کرتی۔“

”آپ یوں ہی دنیا سے ڈر ڈر کر زندہ رہیے۔“ وہ جل کر چلائی۔ ”آپ کے لیے ہی خدشوں نے اور خاموشیوں نے ابو کو اتنا ڈر اور بے حس کر دیا کہ وہ دوسری اہلی.....“

اماں بی نے بے قرار ہو کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”انہوں نے میری اجازت لے کر دوسری شادی کی ہے اور یہ کچھ ایسی انہونی بات بھی نہیں۔ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔“

رانی نے آنکھیں پھاڑ کر اُن کو دیکھا۔

”یعنی! آپ نے خود ابو سے کہا کہ دوسری شادی کر لیں۔“

”ہاں— میں نے انہیں اجازت دی تھی۔“ اماں نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔ ”اسی لیے انہوں نے مجھے طلاق نہیں دی۔ کم سے کم اُن کا نام تو ہے میرے لیے لانا۔ نام پر بیٹھے زندگی بیت جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بعض اوقات زندگی معلوم نہیں مان سے کیسا کیسا خراج وصول کرتی ہے میری جان! اور وقت کی مجبور یوں میں سے کو بھی کچھ تو قبول کرنا پڑتا ہے۔ خدا کی خدائی سے باہر تو نہیں نکلا جاسکتا! نہ مان بیٹھ اپنے ذاتی مفاد کے لیے جیتا ہے بعض دفعہ اپنے ساتھ وابستہ کئی دوسری ہوسم زندہ گیوں کا سوال بھی درمیان میں آ جایا کرتا ہے اور تب..... انسان کو وہی کچھ ماننا پڑتا ہے جس میں سب کی سلامتی اور امن مضمر ہو۔ تم بچہ ہو۔ ابھی ان باتوں کو مانا کچھ سکتیں۔ بس یہ جان لو کہ تم دونوں اُن کی اولاد ہو اور اپنے اخراجات باپ سے

اس دنیا میں خاموش اور چپ چاپ افراد کا گزر ممکن نہیں اس لیے اپنے دکھوں اور مصائب پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع ہی کیوں دیا جائے۔

کھوکھلے لوگوں کو اُداس اور غمگین چہروں کا مذاق اُڑانے کے سوا کچھ نہیں آ ہی خوشی وقت گزرتا بھی تو ایک سحر ہے اس لیے وہ زندگی کے آخری سوڑ تک ذات کو اس سحر میں گم رکھنا چاہتی تھی۔ تاکہ کوئی اس پر اُس کی والدہ اور بہن پر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اُس نے بہت کم سنی میں زندگی سے جو چوٹ کھائی تھی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ اور پرکھ لیا تھا ایسا بہت کم ہوتا ہے اور ایسا نادور تو شاذ ہی کہیں دیکھنے کو ملتی ہے جب ایسے تلخ تجربے کے بعد کوئی کانتوں میں جانے کے بجائے پھولوں اور کلیوں سے لدا چھندا اور خوشبو بانٹتا ہو!

اُس روز کے واضح جواب کے بعد ابو نے لوٹ کر اُسے لے جانے کی کوشش کی۔

یوں بھی وہ اپنی نئی زندگی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے تھے کیوں اماں بی سے جو انہیں ہمیشہ کی ایک دلی کدورت اور عداوت سی تھی اسی چڑم کو لینے آ ن پہنچے تھے ورنہ خدائے انہیں نئی بیگم سے تمن بہت پیارے بیٹوں سے تھا اور وہ اپنی دل پسند دنیا میں گمن ہو گئے تھے لیکن اپنے فرض سے خوب آگاہ رانی کے اکاؤنٹ میں ایک معقول رقم اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے اُسی میں جمع کروادی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ماہانہ رقم کامنی آرڈر گھر کے پتے پر تھا۔

پہلے چل رانی نے بہت شور مچایا ماناں کی جتنی چلائی۔ باپ کے سامنے ہوئے دعویٰ کا پاس تھا اُسے اس لیے اُن کے دیے اخراجات سے انکار کرنا مگر اس موقع پر اُس نے اُس کی ایک نہ سنی اور ایک بہترین ساتھی اور

ساری صنف سے ہی چڑھ چکی ہے۔ ابو کے روپ نے کم از کم مجھے تو یہی یاد کر لیا ہے کہ مردوں کی ذات ہر روپ میں بے اعتبار ہوتی ہے۔ خود غرض..... مطلبی اور مفاد پرست۔ اب آپ خود غور کیجئے اگر آپ کے اور ان کے خیالات میں فرق تھا ہی تو کیا وہ اپنی اولاد اور گھر کے سکون کی خاطر خود کو بدل نہ سکتے تھے؟ کیا اتنی سی بات ان کے اختیار میں نہ تھی؟ بس آپ میرے سامنے ان کی وکالت مت کیا کیجئے۔“

”نہیں چندا! ایسی خراب خراب باتیں نہیں سوچا کرتے۔“ اماں بی نے اشک آلود آنکھیں رگڑ کر کہا ”کچھ بھی ہو بلا خردہ تمہارے باپ ہی ہیں جس کا مرتبہ اس قدرت والے نے ہی بہت بلند رکھا ہے۔ انصاف کیا جائے تو خرابی فقط انہی میں نہ تھی بلکہ مجھ میں زیادہ تھی۔ خطا کار دراصل میں تھی۔ میرے فرسودہ اور زنگ آلود پرانے خیالات تھے۔ اگر ان کو اپنی بے باک اور آزاد فطرت عزیز تھی تو میں ہی خود کو تبدیل کر لیتی؟“

وہ بہت دیر ایک تاسف کے عالم میں گردن ڈالے بیٹھی رہیں جیسے افسوس کے ساتھ ساتھ بے بسی نے جکڑ رکھا ہو! رانی نے انہیں تو کتنا مناسب نہیں سمجھا۔ جی میں آئی جو کچھ کہہ رہی ہیں اماں آج چپ چاپ سن لیتا چاہیے شاید یہ بدتوں کا طاری جمود نونے تو اندر کے خول سے خوش و خرم اور ہر وقت ہنسی مسکراتی ماں برآمد ہو۔

کافی دیر بعد انہوں نے اک دہلی دہلی سی آہ بھر کر اسے یہ غور دیکھا۔ پھر مایوسی اور بے بسی سے ڈک ڈک کر بولیں لیکن..... بیٹی! میرے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔ اس زمانے میں بھی میں نے دنوں اس نکتے پر غور کیا۔ اپنے آپ کو تبدیل کر لینے پر دن رات راسی کیا مگر اس امر پر قادر نہ ہو سکی۔ دنیا میں کون ایسی بد نصیب عورت ہوگی جو اپنے آپ کو اپنے دشمن کو آگ لگانے کی! جب مجھے نظر آ رہا تھا کہ میرے شوہر کن خیالات کے مالک ہیں تو پھر میں خود کیوں نان کے قالب میں داخل گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ

لینا کسی شرم و بے غیرتی کا مو جب نہیں کہلا سکتا۔ یہ تمہارا حق اور ان کا فرض ہے جو اور قانونا دونوں طرح جائز ہے۔“

رانی نے پہلی مرتبہ اماں بی کو اتنی ساری اور گہری باتیں کرتے سنا تھا مگر اُم حیرت ان کی قوتوں پر قرار تھی۔

”لیکن اماں! آپ کو خوب یاد ہو گا میں نے اس روز ابو سے کیسی باغیانہ بات کی تھی اور ان کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ آئندہ ہمیں ان کی اعانت و کفالت ضرورت نہیں ہے۔“

اماں نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ”مجھے سب یاد ہے اور وہ سب کی یادانی کی باتیں تھیں۔ ایسی بچکانہ باتوں کو کون سمجھ دار تسلیم کرے گا! انہوں نے شادی کر لی ہم سے علیحدگی اختیار کر لی تاہم رہیں گے تو تمہارے باپ ہی۔ فرخ تم اپنی خود داریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی رقم لوٹا کر معمولی سی کوئی سروس کر جب کہ ابھی تم تعلیمی اپنی اور عمر کے لحاظ سے بھی کسی سروس کے قابل بھی نہیں ہو تو صورت میں تم پر لوگ اگلیاں اٹھائیں گے کہ نہ جانے کس خرابی کی بنا پر منصور صاحب نے بیوی بچوں سے اس حد تک علیحدہ اختیار کر لی کہ ان کا حق تک نہیں دیتے۔“

”لیکن امی.....“ رانی نے احتجاج کیا۔

”میں نے ابھی کہا تھا بیٹا کہ کہتے کی زبان کوئی نہیں کچلا سکتا۔ تمہاری بے جا وجہ سے تم پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ اول تو میں کہتی ہوں کہ تمہیں ان کی بات مان لینی چاہیے تھی ورنہ اب جو کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔“

رانی نے پھر بھی بھرپور احتجاج کیا تھا۔

”اماں بی! یہ خیال آپ اپنے ذہن سے نکال ڈالے۔ میں نے ابو کے ہا کر غلطی نہیں کی ہے۔ بلکہ یہ میری دانش مندی تھی۔ مجھے تو اب ان سے اور

مجھے ان کی راہ سے ہٹ جانا زیادہ آسان لگا۔ بہ نسبت ان کے ہمراہ چلنے کے دراصل آسان لفظوں میں یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ ہماری شادی ایک بے جوڑ شادی تھی۔ ابتدا بے جوڑ شادیوں کا جو شر ہمارے معاشرے میں ہوا کرتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ بھی ہو گیا۔ میرے اور اُن کے درمیان طبقاتی لحاظ سے بھی زمین اور آسمان کا فرق مائل تھا۔ ایسا تضاد ہماری سوچوں اور دیگر خیالات میں بھی تھا جو رفتہ رفتہ سامنے آیا۔ "اماں! لہجہ بھر کورکیں پھر گویا ہونیں۔" وہ تھے تو ہمارے عزیزوں میں سے ہی۔ مگر وہ بہت امیر کبیر کتبے میں پیدا ہوئے تھے اور میں بہت غریب گھرانے میں! یہ فرق بھی بسا اوقات بہت بڑی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ تم کہو گی کہ اگر ایسا تھا پھر یہ شادی ہوئی ہی کیوں کر! لیکن شاید اسی کو تنذیر کا لکھا کہا جاتا ہے۔ اُن کے والدین بہت ہی نیک دل اور پرانے خیالات کے مالک تھے۔ ہمارے ہاں ان کا والدہ کا کافی آنا جانا تھا۔ پہلے پہل ان ہی کو میں پسند بھی آئی۔ انہوں نے اپنی نیک فطرت کے طفیل بہت بچپن سے مجھے اپنی نظر التفات سے نوازا۔ ہر کام ہر بات میں فوجیت اور اولیت دیتی تھیں۔ کچھ ایسی خوبی تھی ان کی فطرت میں کہ بڑائی چھوٹائی کا قائل ہی نہ تھیں۔ میری شکل صورت اور سیرت کے گن گاتے نہ تھکتیں۔ تمہارے داد بھی تقریباً انہیں کے ہم خیال ہم نوا تھے۔ ان کی اولاد بھی ایسی فرماں بردار اور سعادت مند کہ والدین کی مرضی اور خوشی کے آگے دم نہ مارا اور یوں میں ان کی بہو بن گئی انہوں نے ایک ہل کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ اُن کے آدمی آفیسر اونچے اسٹیشن و آزاد خیال بیٹے اور مجھ جیسی گھٹے سبب اور سٹے سٹے ماحول کی پروردہ لڑکی کے درمیان صدیوں کے قائلے بھی حائل ہو سکتے ہیں؟

اماں بی ایک لہجہ کو سانس لینے کو رکھیں "بہت جلد سانس سہم سے جدا ہو کر راکھ ٹک عدم ہوئے اور..... میں پلا جو دو کوشش کے خود کو تمہارے ابو کے تصورات اور سو

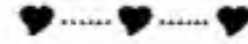
کر مطابق نہ حال نکلی۔ یہ سب مقدارت ہیں بیٹی ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا! مگر میں تم سے یہی کہوں گی کہ اسے غلط انداز میں مت سوچو۔ جس کے اثرات تمہاری آنے والی زندگی پر پڑیں خدا بخوات! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اپنی سوچیں اپنے خیالات ابھی سے بدل ڈالو۔ میں نہیں چاہتی کہ تاریخ اپنے آپ کو ہراسے اور تمہاری آئندہ زندگی رنگ آلود ہو جائے۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں تم بہت خوددار اور بلند خیالات کی بچی ہو مگر جب تک تم اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی باعزت اور بہتر ملازمت اختیار نہیں کر لیتیں اپنے باپ کی رقم خیرات سمجھ کر مت لوٹاؤ۔ حق سمجھ کر استعمال کرو اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے خرچ کرو۔"

اُس دن کے بعد بھی اماں بی اکثر مختلف موقعوں پر وقتاً فوقتاً اسے ایسی ہی نصیحتیں کرتی رہیں۔ اونچے اونچے سمجھاتیں۔ باتوں باتوں میں زمانے کے نقیب و فراز سے آگاہ کرتیں شاید اماں بی کا اصل مشن بیٹی کے دل سے اُس کدورت کو دھونا تھا جو اپنے ناروا ملک سے باپ نے اُسے عنایت کی تھی۔

رانی نے سائنس گروپ کو خیر باد کہہ ڈالا تھا اور اب چار برسوں کے بعد بہت اونچے نمبروں کے ساتھ انگلش میں ماسٹر ڈگری حاصل کر لی تھی۔ خوش نصیبی سے رزالت اذیت ہونے کے فوراً بعد ہی اُسے پریم گڑھ کے زیب النساء کالج برائے خواتین میں جاب مل گئی تھی۔ جس سے وہ بہت مطمئن اور پرسکون ہو گئی تھی۔ قدرت نے بہت قریب ہو کر اس کی سنی تھی اور اماں بی کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔

کالج کا ماحول اور اندرونی دنیا اُس کے تصورات سے بھی بڑھ کر پاکیزہ اور گہری سحری نگلی۔ چند ہی ہفتے سب سے رہنے کے بعد وہ سب سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ جب انسان اندر سے مطمئن ہو تو ہر کام میں توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کرنا چلا جاتا ہے۔

وہ بھی اپنی طالبات کو بے حد دل لگا کر اور محنت و مکمل توجہ سے پڑھاتی تھیں۔ چنانچہ جلد ہی اس کی جاں فشانی اور لگن و توجہ سے پڑھانے کی دھوم مچ گئی۔ وہ طالبات میں مقبول تھیں اُس سے زیادہ ساتھی اساتذہ قدر کرتے۔ پرنسپل صاحبہ کی فہمائش لگا ہی بہت جلد اس کو ہر نایاب کو پرکھنے میں کامیاب ہو گئیں اور وہ رافڈ بہت اہمیت دیئے گئیں۔ ہوتے ہوتے اس مقبولیت اور ہر دل عزیز کا دائرہ اتنا بڑا ہوا کہ صاحبزادی زیب النساء جو اس کالج کی روح رواں اور پرنسپل تھیں ان ہوتا ہوا یہ تعلق اُن کی مہنی اور بھتیجی تک پہنچا تو بے تکلف اور اپنائیت بھرے دوسرے رویے میں تبدیل ہو گیا اور یہ تینوں لڑکیاں آپس میں اتنی شیر و شکر ہو گئیں کہ دنیا والے حیران رہ جاتے۔



دلاں دیارِ آواں تے پیرے بچوں لگدے
مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ بچو سکدے
مینوں رب نے بنایا تیرے لئی اوئے
متھے تیرا ناں لکھ کے
بوائے باریاں تے نال کنڈاں شپ کے
آواں گی ہوا بنز کے۔ بو ہے باریاں

دل کو چھو لینے والے بول تھے۔ جب تک رانی چولہا بند کر کے ہاتھ پونچھتی ہوئی نئی دی لاؤنج کی طرف بھاگی، نغمہ ختم ہو چکا تھا اور اب اسکرین پر کوئی دوسرا ہی منظر تھا۔ اس نے بور ہو کر شرمین کی طرف دیکھا جو صوفہ پر قد رے حیران سی بیٹھی تھی۔ شاید یہ نغمہ اُس کو بھی بھا گیا تھا۔

”سنا آلی! کتنا پیارا گانا تھا؟“ رانی کو دیکھ کر وہ بڑے جوش لہجے میں بولی۔

”یہی تو سننے دوڑی تھی۔ مگر ختم ہو گیا۔“ رانی نے منہ بنا کر کہا۔

”اچھا تو یہ آپ کو بھی پسند آ گیا؟ لیکن اس کا مطلب معلوم نہیں کیا ہے؟“

”ایسی بے پرکی اور بے مکی خبریں وہی اڑایا کرتے ہیں۔“ علی کے نام پر وہ

”کیوں..... کیا میں انہیں کاٹ کھاؤں گی۔“ رانی کو پھر تباؤ آ گیا۔ ”لوگ بننے تو ایسے ہیں جیسے بڑے سیدھے ہوں اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اُن سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم نہیں کون ہیں کون نہیں۔ جہاں کسی نے اچھی طرح بات کی، لگیں اُسی کے گن گانے۔ لو بھلا! اب میرا کالج گھاؤں میں بتا دیا۔ خود ہی ہوں گے دیہاتی، اُچھلے گنوار اور جانگھوس کہیں کے۔ ہر وقت میرے خلاف کان بھرتے رہتے ہیں تمہارے۔ اب اُن عقل سے پیدل بندے کو یہ کون بتائے کہ مجھے تو بہت پہلے سے پنجابی زبان آتی ہے۔ بولنی بھی اور سمجھنا بھی۔“ رانی بولنے پر آئی تو

ہوتی چلی گئی۔

ساتھ ہی اسے مہینوں پہلے کی وہ شام بھی یاد آنے لگی جب اس نے پہلی مرتبہ بس میں بیٹھ کر بیکارڈ سنا تھا۔ اسی روز تو علی کو بھی پہلی دفعہ ہی دیکھنا تھا۔ یوں تو رانی اور کے رکھ رکھاؤ اور شخصیت سے بہت مرعوب ہوئی تھی مگر اپنی غیر موجودگی میں ان کا بار گھر پر آنا اور گاہے بگاہے شرمین کی وساطت سے ان کی چھیڑ چھاڑ سے بچنے لگی تھی۔

شرمین جو اس کی چلی کئی باتوں سے ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی اپنے قہقہے پر قابو پا کر بولی۔ ”آپا..... آپ یہ تو چھپا ہی گئیں کہ پنجابی زبان اگر کچھ آج نے کالج سے نہیں سیکھی تو پھر کہاں سے سیکھی تھی؟“

اس کا انداز اب مشکوک تھا جسے محسوس کر کے وہ چیخ پڑی۔

”بالکل ہی گھاس کھا گئی ہے کیا شرمین کی بچی! تم اماں بی سے تصدیق کر سکتی کہ یہ زبان مجھے ”مائی سریاں“ نے سکھائی تھی۔“

”مائی سریاں؟“ شرمین نے حیرت سے آنکھیں چھپکائیں۔ ”یہ کون ذرا شریف ہیں؟“

”تمہیں ایک۔“ رانی نے بے پردہ اسی سے جواب دیا۔ ”تم بہت چھوٹی ہو کر رہی تھیں۔ دونوں ماں بنی معلوم نہیں کہاں سے پھرتی پھراتی آ گئی تھیں۔ بہت غریب ہو گئے آسرا تھیں۔ اماں بی نے رحم کھا کر انہیں اپنے گھر رکھ لیا۔ ابو نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کافی عرصے ہمارے ہاں رہیں۔ مائی سریاں سے اماں بی کو بہت آرام تھا۔ گھر کے اوپر کے سارے کام اس نے سنبھال رکھے تھے۔ اس کی بیٹی شاداں میر۔ اور تمہارے ساتھ لگی رہتی۔ پھر بعد میں شاداں کی شادی کے سلسلے میں مائی سریاں اپنے گاؤں گئی تو وہاں ہی تائی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ ہی کہیں رہ گئی۔“

”اچھا..... تو آپ نے پنجابی زبان انہی سے سیکھی تھی۔“ شرمین نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

”ہاں..... یہ حقیقت ہے۔“ رانی نے جواب دیا۔ ”شاداں اور مائی سریاں ہم انہوں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتیں مگر آپس میں پنجابی بولا کرتی تھیں۔ مجھے یہ زبان بہت پیاری لگتی۔ رفتہ رفتہ میں بھی سیکھ گئی بلکہ شاداں سے تو پنجابی ہی بولا کرتی۔ اماں بی بے چاری کو پتا بھی نہ چلا۔ دو پہر میں جب وہ کمر بند کر کے تمہیں لے کر سو پایا کرتیں تو میں دبے پاؤں وہاں سے فرار ہوتی تو لان کے اس کونے میں جہاں اماں اور اماں کے اونچے بیڑوں کے نیچے شاداں اپنی کپڑے کی گڑیاں سجائے کھیل رہی ہوتی۔ آ کر دم لیتی۔ بڑی ہی کمال کی لڑکی تھی شاداں بھی۔ اکیلی ہی گڑیوں کی شادی کرتی۔ انہیں سجاتی سنوارتی انہیں رخصت کرتی اور پنجابی بولنے لگتی تھی۔“

”ٹپے؟ پنجابی بولنے کیا آتا؟“ شرمین نے احتیاط کی طرح دریافت کیا۔

”جس طرح اردو شاعری میں لوک گیت ہوتے ہیں۔“ رانی نے اسے سمجھایا۔ ”اس طرح بس تم پہ بھوکہ پنجابی لوگ گیتوں کی ایک قسم کو ”ٹپے“ کہا جاتا ہے۔“

”آپ کو تو آتے ہوں گے آپا مجھے بھی سنائیے!“

شرمین نے خوشامد کی۔ رانی کا موڈ خود بخود درست ہو چکا تھا۔ کھنکھار کر بولی۔ ”اچھا! دو تین ٹپے سنا دیجی ہوں۔ ویسے کوئی خاص آتے تو نہیں مجھے۔“ اس نے ایک لمحے ذہن پر زور دیا پھر بلند آواز میں گانے لگی۔

حقہ پی دے او دم لا کے

آون دیاں بڑیاں خوشیاں

جانمے او غم لا کے

پانی تل کے توں رنچ پچا

”بلاوجہ کہاں سے یاد آگئی اماں۔“ رانی بہ دستور چلے بھنے اعزاز میں ہوئی۔
 ”دعی چڑیل پوچھ رہی تھی کہ آپ نے پنجابی زبان کہاں سے سیکھی ہے؟“
 ”ہاں کچھ کہتی ہو بیٹی۔“ اماں بی نے گزر اوقت یاد کر کے ایک ٹھنڈا سا نس بھرا۔
 ”وہ دونوں ماں بیٹی تو بہت ہی سادہ دل اور کھری نیت کی لوگ تھیں۔ ا۔۔۔۔۔ کیا وقت
 تھا وہ بھی! اور اب کہیں تم ماسی مریاں بے چاری کو دیکھ لو تو پہچان بھی نہ پاؤ!۔“
 ”لیکن..... آپ نے کہاں دیکھ لیا اے؟“ رانی نے حیران ہو کر پوچھا۔
 ”کافی دن گزرے آئی تھی ایک دن۔“ اماں بی نے افسوس کے لہجے میں جواب
 دیا۔ ”بے چاری بہت ہی کم زور پڑنیوں کا ڈھانچا ہو رہی تھی۔ مجھے اُس کی حالت دیکھ
 کر بہت رنج ہوا۔ اب تو وہ کسی کام دھام کے لائق بھی نہیں رہی۔ یہاں شہر سے باہر
 ہی کسی بستی کا نام بتا رہی تھی کسی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ بتا رہی تھی کہ شاو کے کئی
 ایک بچے ہیں۔ شوہر اُس کا بہت سخت گیر اور اکڑھم کا تھا۔ ساس سے بہت اُکڑا
 اُکڑا سا رہتا تھا۔ یہ ٹھیری غیور فطرت اور محنت کش عورت۔ کافی عرصے تو اپنی بے پناہ
 متاد اور بیٹی کی محبت میں اس کے در سے چٹھی رہی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شاو بھی
 اور کچھ تم سمجھو غربت بھی بہت بڑی شے ہے ماں سے کبھی کبھی سی رہنے لگی ہوگی۔ بس
 ایک روز..... ماسی مریاں چپ چاپ سے بیٹی داماد کے گھر سے نکل آئی۔“
 ”اللہ میری توبہ۔“ رانی نے دیر سے رد کا ہوا سانس لیا۔ ”میں سمجھی..... وہ.....
 شاو ہی سرگئی شاید۔“

”ارے..... اللہ نہ کرے“ اماں بی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”میرا خیال ہے
 اماں!“ رانی ان کے قریب آ بیٹھی۔ ”کیوں نہ ہم ایسے موقع پر ماسی مریاں کا سہارا
 بن جائیں اور اُسے گھر رکھ لیں؟“
 ”لیکن بیٹی! اب وہ کام کاج تو کر نہیں سکتی!“ اماں بی نے اُس کی لاچار بیانی

ماسی داویدار کر کے

کے داغ کھینچا

”رانی یہیں تک چاکی تھی کہ شرمین کو مزید ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ بیٹے
 دیا نے زور زور سے قہقہے لگاتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ دراصل رانی کی آ
 گانے کے لیے بالکل غیر موزوں تھی۔ زبان تو ویسے ہی شرمین کی سمجھ میں نہیں آ
 تھی۔ اوپر سے اس کی غیر دل کش آواز اور بے سرائی۔
 وہ جھٹے جھٹے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

رانی کے چوں میں بے یک لگ گیا۔ وہ اُسے بے تحاشہ برا بھلا کہنے لگی۔
 ”خود ہی گانے کو کہا اور خود ہی۔۔۔۔۔“

ان دونوں کا شور و غل سن کر اماں بی جانے کب کمرے میں آ گئی تھیں۔ رانی
 بے سرے چنے انہوں نے بھی سنے۔ مسکرا وہ بھی رہی تھیں مگر احتیاطاً ہنسی روک
 تھی۔

”کیا ہو بیٹی! کیوں اتنی چراغ پا ہو رہی ہو؟“ انہوں نے تجاہل حارقانہ مزہ
 ”ہوتا کیا؟“ رانی نے بے مزہ ہو کر جواب دیا۔ ”خود ہی خوشامد کرنے لگی کہ
 سناو۔ میں نے شاو سے سنے ہوئے چنے سنائے تو..... ہنسی کا دورہ پڑ گیا گدھی کو
 اماں بی جسنے لگیں۔

”کیوں؟ میں نے اُسے بچوں کے بجائے لطیفے سنا دیے اماں بی؟“ رانی
 اب تک چڑھا ہوا تھا۔

”ارے جانے دو بیٹا!“ اماں بی نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔ ”تمہیں
 ہے اُسے تو جسنے شور مچانے کا موقع چاہیے۔ ہر بات میں ہلڑ بازی کا پہلو نکال
 ہے۔ تم یہ بتاؤ آج تمہیں شاو کہاں سے اتنی مدت بعد یاد آ گئی؟“

کی۔

”اسی لیے تو میں یہ بات کہہ رہی ہوں۔“ رانی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آخر ایک فرد کے اضافے سے ہم کسی زبردست مالی بحران سے دوچار ہونے سے رہے۔ گھر کا کام کاج جس طرح ہوتا ہے۔ رہے گا۔ ماسی مریاں سے کوئی خدمت لینا ضروری تو نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ گھر میں ایک بزرگ کی موجودگی بڑی خوش آئند رہے گی۔“

”خوش رہو میری بچی!“ اماں بی نے بے اختیار اُسے گلے لگا لیا۔ ”بہت سہج ہوئی اور قابل قدر سوچ ہے میری بیٹی کی۔ اب اگر کبھی ماسی مریاں آگئی تو یقیناً اُسے بڑی خوشی اور بے فکری سے اپنے گھر میں روک سکوں گی۔ یہ یقیناً ثواب کا ہوگا۔“



بادل اتنے گہرے اور سیاہ کہ دوپہر کے دو بجے اُمنڈتی شام کا سماں لگ رہا تھا۔ جنگل کا راستہ آوارا ہواؤں کے سرو جھونکے، بس کا انتظار اور تھلاڑکی۔ مارے جھٹا ہٹ اور کچھ خوف و تشویش کے احساس سے رانی کی آنکھیں بار بار لگی ہوئے لگیں۔

سویرے اماں بی کے منع کرنے کے باوجود گھر سے کالج کے لیے نکلی تھی تو بارش کا ہاتھی امکان نہیں تھا۔ دن کے بارہ بجے جب وہ پیرٹے لے رہی تھی تو ہلکی پھوار آنے لگی۔ آسمان سے زمین کی طرف مہین مہین باجرے کی سی بوندوں کا تسلسل بندھ گیا۔

آسمان کے انتہائی گوشے میں سیاہ بادلوں کے دل کے دل جمع ہونے لگے جیسے کوئی سازش کر رہے ہوں۔ ہوا کے رخ کر دینے والے جھکڑوں میں شدت پیدا ہوئی۔ رانی نے فوراً ہی واپس جانے کی ٹھان لی لیکن مسلسل ایک گھنٹے سے کھڑے کھڑے اس کے پاؤں جواب دیے جا رہے تھے۔ اضطراب تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر بس تھی آ کے نہ دے رہی تھی۔ ایک بس آئی بھی تو اس میں رش کا یہ عالم تھا کہ وہ باوجود

”اماں“

ان بھاری لمحات میں جبکہ اندر باہر ہر طرف ساون بھادوں کی جھڑی لگی تھی اس تصور میں ابو کی لمبی چوڑی گاڑی آٹھیری۔ بے کسی اور نظر انداز کیے جانے کا جاس شدید قسم کی محرومی بن کر دل و جاں پر محیط ہو گیا۔

”ابو۔۔۔ میرے بے حس‘ بے درد اور پتھر دل ابو!“

رائی کا جی چاہا، بلک بلک کر باواں بلند رونے لگے۔

پتا چلا کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کس باپ کی بیٹی ہے۔

بارش کا زور کچھ ٹوٹا تو وہ اپنے ارد گرد دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ بارش سے بچاؤ کے لئے ہی اسکو نرسوار اس درخت کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔ اب اچھی بھلی بھیڑی ہو گئی۔ اُسے اپنے بھیکے ہوئے لباس اور کانپتے ٹھٹھرتے وجود سے خود ہی فجائت نے لگی۔ وہ مزید سمٹ کر رہ گئی۔ بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتے موتی چہرے کو بھگور رہے۔ ان لمحات میں وہ ایسی نروس اور اپ سیٹ ہو چکی تھی کہ ساری کی ساری اکڑنوں اور کی طراری ہوا ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ میں نہ رہا تھا کہ اپنی آج کی درگت اور شامت پر نے یا نہ؟ غم و اندوہ سے مر جائے یا زندہ در گور ہو جائے۔

چنانچہ اس دفعہ انسانوں سے کچھ کچھ بھری بس آ کر رُک کر تو وہ رش اور وحکم بیل کا ال کے بغیر اُس کی طرف لپکی۔

ذہن میں ایک ہی خیال تھا اس ماحول سے نکل بھاگو۔“

شدید بیکانی کیفیت میں وہ نگاہیں جھکائے جھکائے سرک کر اس کرنے لگی۔

کنڈیکٹر چلا چلا کر مسافروں کی ہانک لگا رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نظریں تیروں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ بس کی چپت سے لپٹے دروازوں سے لٹکے اور لائیوں سے جھانکتے لوگوں کے لیے سرد ہواؤں، برستی بارش اور کڑکتی بجلی کے ساتھ

بزار چاہنے کے بھی کھڑے اور لٹکے ہوئے مردوں کے پاس کھڑے ہونے کی نہ کر سکی۔

اپنی قوم کے حسین و جمیل دل و دماغ اور ان کی سوچوں اور خیالات سے خوب واقف تھی جو سفر کے دوران دور سیٹ پر بھی لڑکی کو آنکھوں ہی آنکھوں تو لپٹے گھورنے اور کھا لینے کی ہر ممکن کوشش کر لینا اپنا پہلا فرض سمجھتے ہیں۔ شکاریوں کی طرح کبھی رنگین چشموں سے اور کبھی اخبار کی اوٹ سے مسکرا مسکرا دیکھتے ہیں جیسے آج ہی گھر سے باہر کی دنیا اور کوئی لڑکی دیکھی ہو اور پھر سفر کا طویل یا مختصر کیوں نہ ہو اسی آنکھ پھولی میں گزر لیتے ہیں۔

ایسے ماحول اور فضاؤں کو پرکھی ہوئی رائی‘ مردوں کے دوش بدوش کھڑا سفر کرنے کی ہمت کیسے کر سکتی تھی۔ انتہائی ٹڈر اور پراعتما ہونے کے باوجود بے پاک نہیں ہو سکتی تھی!

دُور دکھائی دینے والے ریت کے ٹیلوں اور درختوں کے جھنڈ کے عقد گھر سے سیاہ بادلوں کا پرے کا پرامنودار ہوا اور دھما دھم کڑکتا برساتا میں سر پر آ گیا وہ زور زور سے کڑکتی برستی بجلی اور بارش کی تیز بو چھاڑ سے گھبرا کر شیا درخت کی طرف بھاگی اور بے اختیار اس کے مونے اور مضبوط تنے سے کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ ایسا نوٹ کر رہا کہ جلد ہی شیشم کے کٹھے چوں سے بھی بوند! لگیں۔ آن کی آن میں وہ پوری بھگ گئی۔ جوتوں میں پانی بھر گیا۔ جراثیم گئیں اس پر ستم بندوں میں اتر جانے والے رخ بست جھکڑ اپنی بے بسی اور لاچار خیال سے وہ ہراساں ہو کر رو دی اور موسلا دھار بارش کے بستے پانیوں میں کھڑے مسافروں کو پتا بھی نہ چلا کہ کس کی آنکھیں بھی ساون بھادوں کی طرح

بھینگی ہوئی تنہا لڑکی ایک دلچسپ تماشا بن گئی تھی۔

میں اس وقت جب کہ وہ بس میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی، ایسی ہی صورت گاڑی اُس سے تقریباً مس ہوتی ہوئی جھٹکے سے لڑکی دروازہ کھول کر چلا جلدی سے اُس کا ہاتھ تھاما چشم زدوں میں فرسٹ ڈور کھول کر دھکیلا اور ایک سینکڑے بھی کم وقت میں گاڑی لے اڑے۔

اُن کا چہرہ کسی اندرونی احساس اور شدید کوفت سے تپ رہا تھا۔ وہ سنا دکھ کے ملے ملتے تاثرات کے ساتھ لب سختی سے بچنے لگا لڑی ڈرائیور کر رہے تھے۔ اندر کے نیم گرم اور خواب ناک ماحول میں ٹھنڈے کا اثر زائل ہوا تو شانوا چپکا ہوا ڈوپٹہ اور بھیکے بھیکے لباس نے اس میں اپنی بے سرو سامانی حالات کی اس قسم ظریفی اور پھر علی کی اچانک آمد ڈرامائی انداز اُن کو کھاروینہ اور ان کی موجودگی نے اُسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس کا زرد وین اپنی کم مائیگی اور سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ احساسِ پشیمانی حد سے بڑھا۔ اُس نے ڈیش بورڈ پر سر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بارش کی تیز آواز کے باوجود علی اُس کی سسکیاں صاف سن رہے تھے۔ مگر جہود کی سی کیفیت میں سامنے نظریں جمائے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ رہے۔ اسکرین پر رانی کے آنسوؤں کی طرح ایک کے بعد ایک بوندیں ٹوٹ ٹوٹ کر پڑا تھیں۔ یوں جیسے کسی نے سچے موتیوں کی مالا توڑ دی ہو یا بساط آسمان پر ستاروں کی بارات اتر آئی ہو۔ مگر اس وقت اُن دونوں کا ذہن مختلف خیال آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ طوفانی جھکڑوں اور دھواں دھار برسی بارش سے عاجز آ کر نے گاڑی سڑک سے اتار کر برگد کے ایک کھنے بیڑ کے نیچے کھڑی کر دی اور زبا ایک لفظ کہے بغیر اپنا گرم چادر خانے کا کوٹ اُتار کر اُس کے لرزتے کانچے شا

ال دیا اور رانی منع بھی نہ کر سکی حواس درست ہوئے تو اُس نے پرس میں سے فنگ مال نکال کر آنکھیں پونچھیں جو شدت گریہ سے متورم ہو رہی تھیں۔ تب علی نے سامنے سے نظریں ہٹا کر اُسے جی بھر کر دیکھا۔ رخساروں پر چمکی ہوئی بالوں کی ننھی ننھی لٹول اور سرخ سرخ چہرے کو دیکھ کر وہ متضاد کیفیت کے شکار ہو گئے۔

غصہ بھی آیا ترس بھی، ہم دردی بھی محسوس ہوئی۔ افسوس بھی ہوا۔ اماں بی سے وہ بہت زیادہ کھل مل گئے تھے اور ان لوگوں کے گھریلو حالات ابوی کی بے التفاتی بے مروتی اور رانی کے فعلوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ دلی طور سے ان تینوں ماں بی کے بہت ہم درد اور خیر خواہ تھے۔ گو کہ رانی کو اُن کی اس حد تک کی معلومات اور گہرے ربط کا علم نہیں تھا، تاہم شرمین کی زبانی ان کا ذکر سن کر ارجحیت کا احساس سرور کم ہو گیا تھا اور آج ان لحاظ میں تو انہوں نے فرشتہ رحمت کی طرح نمودار ہو کر اُس کی امداد کی تھی۔ وہ مسنون تھی اُن کی۔ کم سے کم لوگوں کی خبیث نظروں کے اشاروں سے تو محفوظ تھی اس وقت!

انہوں نے بہت سنجیدگی سے اُسے ڈانٹ پلا دی۔

”آپ کو یہ رائے کس نے دی تھی مس منصور اکہ آپ ایسے خراب موسم میں مگر سے نکل پڑیں؟ اگر آج لیکچر نہ دیتیں تو آپ کی سروس ختم ہو جاتی؟“

”صبح ایسا موسم کب تھا؟“ رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”بزرگوں کی حکم عدولی کی سزا ایسی ہی ہونی چاہیے۔ اماں بی کے روکنے پر بھی آپ کو خیال نہ آیا۔“ وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولے۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ رانی مارے حیرت کے پوری آنکھیں پھاڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ ہل کے ہل اُسے لگایا ساحر آنکھوں والا شخص سچ سچ جاوہر ہے جو دلوں کے مجید جانتا ہے اور دوسروں پر گزرنے والے حالات بھی۔

کھنکھاتا ہو گئے ہوں۔ انہوں نے اطمینان کا گہرا سانس کھینچا پھر کہنے لگے۔ "آپ اپنی تحسین کے" جی ہماری پرنسپل صاحبہ تو ایک نواب زادی ہیں۔" انہوں نے کالج قائم کیا اور خود بلا معاوضہ خدمت انجام دیتی ہیں۔ تو ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کی پرنسپل نواب زادی زیب النساء صاحبہ کے انسانیت پرست دھڑکتے دل میں یہ خیال کیسے آتا کہ وہ لیکچرارز کے آنے جانے کے لیے کم از کم ایک بس کا ہی انتظام کرویں!! کیا یہ خدمت خلق نہ ہوگی؟"

پھر رانی کا بگڑتا موڈ دیکھ کر جلدی سے اضافہ کیا۔ "ہاں۔ کہہ دیجئے وہ بس تو ایک ایک ہزار کاریں چلواسکتی ہیں اور مثال کے طور پر یہ کار بھی انہی کی ہے جس میں اس وقت بیٹھی ہوں۔"

گمران کی تمام احتیاط کے باوجود رانی بھڑک چکی تھی۔ ان کی لمبی چوڑی تمہید اور اپنے والا لہجہ سے بڑا معلوم ہوا۔ تاہم اس نے تحمل سے کام لیا اور سنجیدگی سے بولی۔ "میں نے اس روز ان کی سیرت اور اعلیٰ کردار کے لیے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ بلکہ یہ علم ہی بتایا تھا کیوں کہ جو خدمت خلق وہ کر رہی ہیں درحقیقت اس سے بھی کہیں زیادہ عظیم اور بلند تر ہیں۔ عام ذہنیت کا انسان تو ان کی ہمسری کر ہی نہیں سکتا۔ آپ کے نزدیک یہ بات صرف مذاق ہے جبکہ ایک بس کا انتظام کروانا ان کے لیے بہت بڑا وقت طلب مسئلہ نہیں۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ ان کے ہوٹل کا انتظام اتنا مکمل اور اعلیٰ ہے کہ تمام لیکچرارز ہر روز آنے جانے کے بجائے ہفتہ بھر وہیں رہنا پسند کرتی ہیں۔ وہاں کی رہائش یا نکل فری ہے اور رسالے اخراجات نواب فیملی خود ادا کرتی ہے۔ ہر طرح کی سہولت اور آسائش ملتی ہے ان لوگوں کو۔ میں چوں کہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے رہ نہیں سکتی اور پھر بس اسٹاپ کے سامنے سے تو کالج کی عمارت نظر آتی ہے اس لیے ہر روز کے آنے جانے کو سہل سمجھتی ہوں۔ اب وہ فقط

علی نے کمر بھرا سے حیران ہی رہنے دیا۔ پھر بتانے لگے۔ "جناب! میں کچھ دم قبل اماں بی کی ہی خدمت میں بیٹھا تھا۔ تب..... بس اچانک ہی خیال گزرا تھا کہ کہیں..... آپ....." انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی اور ڈش بورڈ پر لگے ہوئے لائٹر کا بیٹن دبا کر سگریٹ سلگانے لگے۔

ان کا موڈ آپ ہی آپ درست ہو گیا۔ چہرے پر برستی خشونت کم ہو گئی اور اب ہلکے ہلکے دھوپ کے پس منظر میں ان کے خوب صورت ہونٹوں پر ایک دل نواز مسکراہٹ چمک رہا تھا اور محسوس تھا کہ وہ مستی سی چھا رہی تھی۔

خبر نہیں کس کے قرب کا طلسم تھا۔

بھیکے بھیکے موسم کا اثر یا کوئی خوش آئند سا خیال بہر حال کوئی بات تھی ضرور جسے رانی اپنی الجھن اور پشیمانیوں میں محسوس نہیں کر پار رہی تھی۔ تھوڑا سا بس کر انہوں نے اس کے بھیکے وجود پر ایک اپنی سی نگاہ ڈالی پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔ "بارڈر تھمنے کے تو کوئی آثار نظر نہیں آ رہے اور آپ کو سردی بھی لگ رہی ہوگی۔ براہ کرم آپ یہ کوٹ اچھی طرح لپیٹ لیجئے۔ خدا نخواستہ ٹھنڈ لگ گئی تو مجھے..... میرا مطلب ہے اماں بی بہت پریشان ہوں گی اور آپ کے بھی پڑھنے پڑھانے کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اپنا نہیں تو دوسروں..... یعنی اپنی اسٹوڈنٹس کے مفاد کا خیال رکھیے۔"

رانی کو ان کی باتوں میں کافی بے رہ لگی سی محسوس ہوئی۔ وہ قدرے پریشان آہو کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔ تاہم اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ان کا کوٹ جواڑنے سے بے توجہی سے سیٹ کی پشت پر ڈال دیا تھا اٹھا کر بڑی احتیاط اور اپنائیت سے اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا۔

علی کو ایک گونہ اطمینان کا احساس ہوا جیسے رانی نہیں بلکہ وہ خود سردی کی شدت

میری وجہ سے تو ایک پوری بس چلوانے سے رہیں۔ نہ میں ایسی چھوٹی بات اُن کہہ سکتی ہوں۔ ویسے میں نے کبھی اُن سے اپنی اس دشواری کا ذکر بھی نہیں کیا اور نہ انتظام.....

علی نے اس کی بات کاٹھے ہوئے کہا۔ ”اوہو..... آپ تو پھر اُن کی جگہ بلکہ..... لاڈلی ی لگتی ہیں۔“ اُسے جانے کو ایسے مشکوک لہجے میں کہا کہ نتیجہ اُن حسبِ فضاء نکلا۔

وہ جھج کر بولی۔ ”اور کیا۔“ وہ تو مجھ سے محبت و شفقت سے پیش آتی ہیں۔ کی صاحبِ زادی افروز جہاں اور جتنی شاہ جہاں میری بہت گہری اور اچھی دوست ہیں۔ ہر روز مجھے ”قصرِ دیدار“ بلایا کرتی ہیں۔“ اُس کے لہجے میں بچوں جیسی محسوس اور فخر جھلکتے لگا۔

”قصرِ دیدار!“ وہ مسخرانہ انداز میں ہنسنے۔ پھر سادگی سے پوچھنے لگے۔

”اچھا۔“ تو پھر صاحبِ زادہ دیدار بھی بہت پیار کرتے ہوں گے آپ سے ”جی..... کیا مطلب؟“ رانی بھونچکی رہ گئی اور حیران ہو کر اُن کی صورت نگہی۔

علی جلدی سے بات بنا کر بولے ”بھئی آپ خود ہی تو بتا رہی ہیں کہ وہ صاحبِ زادوں آپ کو بہت چاہتی ہیں، زیبِ النساء بیگم بہت محبت کرتی ہیں تو میں ۲ چاکر صاحبِ زادہ دیدار کیوں پیچھے رہنے لگے۔ وہ بھی آپ سے بہت پیار.....“

”سٹ آپ.....“ رانی کانوں تک سرخ پڑ گئی اور ان کی طرف سے رخ ہٹا لیا۔

”ارے..... آپ تو بہت تھا ہو گئیں مس منصور!“ وہ بین کر بولے۔

صاحبِ زادے بہت بوڑھے ہیں یا۔۔۔ بد صورت ہوں گے۔“

”میں نے تو آج تک انہیں دیکھا تک نہیں۔“ رانی کی بات سے بے ساختہ بلا ارادہ ہی نکلا۔

مگر کہتے ہیں پچھتاہی کیوں کہ اب کار کے محدد سے ماحول میں علی کے قہقہے کو سُر رہے تھے اور وہ اس طرح شرمندہ ہو رہی تھی جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑ لی گئی ہو۔

باہر بادش یوں برس رہی تھی جیسے آج کے بعد پھر کبھی نہ برے گی۔ ٹھنڈی لگنا میں تھیں کہ امندی چلی آ رہی تھیں۔ ہواؤں کے باؤ لے جھکڑ تھے کہ چلے جا رہے تھے۔ سڑک سے تشیب کی طرف چھا جوں میں پرنا لوں کی صورت بہتا چلا جا رہا تھا۔ تیز ہو چھاڑ کی وجہ سے ٹریفک کی آمد و رفت تھمی ہوئی تھی۔ شاید ان کی طرح سے دوسرے لوگ بھی کہیں پناہ گزین تھے۔

اس طوفانی موسم اور ہر لمحہ بدحالی تاریکی کے باوجود جانے کیوں رانی اندر سے پہلے کی طرح غیر مطمئن اور ہراساں نہیں تھی۔ سچ ہے شاہراہِ حیات پر اپنا ٹک ل جانے والے کچھ افراد کم وقت میں زیادہ اعتماد حاصل کر لیتے ہیں اور غیر ہو کر بھی اتنے قریب اتنے اپنے اور اتنے عزیز سے لگتے ہیں کہ جسے بے پناہ بھروسہ اور اعتماد ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس تعلق خاص کو دل محسوس تو کر سکتا ہے بیان نہیں کر سکتا۔

تھوڑی دیر کے بعد علی نے اپنی شریر قسم کی مسکراہٹوں پر قابو پایا تو سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولے۔ ”پہلے چھوڑ دینے بہت انجوائے کر لیا۔ آپ یہ بتائیے مس منصور! کیا آپ ایک چھوٹی سی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتیں؟ کم ازان و اہیات قسم کی بسوں کے بورسز سے تو نجات حاصل کر لیں گی!!“

وہ ان کے خواہ مخواہ ہنسنے سے یوں ہی بھری بیٹھی تھی جیسے لہجے میں بولی۔

”سب کو اپنے ہی زاویہ نظر سے مت دیکھا کیجئے۔ میرے پاس لاکھوں روپے کے

”آ..... آپ کا مطلب ہے خود چلاؤں؟“ وہ وحشت زدہ ہو کر پلائی۔
 ”جی..... نا..... کالج کے زمانے میں ایک بار میں نے اپنی ایک دوست کی
 گاڑی پر رانی کی تھی۔ اُف..... خدا کی پناہ! یوں لگتا تھا جیسے آگے پیچھے کی طرح ساری
 ٹریفک میرے سر پر چڑھ آئی ہو..... خدا بچائے۔“
 ”ہے بزدل!“ علی نے جانے کس موڑ میں آ کر اُس کے بھیکے بالوں پر ہلکی سی
 پپت رسید کر دی۔

پھر بڑے شاہانہ انداز میں کہنے لگے۔ ”ہم تمہیں ایک ماہ کے اندر اندر گاڑی
 چلاتا سکھا دیں گے اور ساتھ ہی لائسنس ڈرائیونگ بھی دلوائیں گے فری بلا معاوضہ۔“
 پھر بڑے مزے سے ٹیپ آن کر کے ’گاڑی اشارت کر دی۔



نوٹ فالٹو نہیں ہیں۔“

”ارے تو پہ کیجئے..... پناہ مانگئے۔“ وہ قیمتی انگوٹھیوں والے ہاتھ سے اپنے کان
 چھو کر بولے۔ ”لاکھوں روپے کی بات تو یہ خاکسار نہیں کر رہا..... اتنی سکت تو مجھ میں
 بھی نہیں۔ یہ بے چاری سیکنڈ ہینڈ کی تھی۔ یہ مشکل اسی پچاسی ہزار میں پڑی تھی مجھے۔“
 ”تو جھکاتی گاڑی اور اسی پچاسی ہزار روپے؟“ رانی نے بے اعتباری سے
 انہیں گھورا۔

”ہاں..... ہاں.....“ وہ یقین دلانے والے انداز میں جلدی سے بولے۔

”ارے آپ کو یقین نہیں ہے! یہ تو سب نئے ٹکڑے اور بہترین ریپر کرتے والے کا
 کمال اور ہنر ہے ورنہ یہ تو سیکنڈ ہینڈ ہے۔ صرف ٹکڑے نئی نئی سی ہو گئی ہے۔ یقین نہ
 آئے تو اتنی ہی رقم میں آپ کو دلا دوں؟“

رانی راگھ ہوشیار ہونے کے باوجود نا تجربہ کار اور ایسے حساب کتاب سے نا آشنا
 تھی۔ دل ہی دل میں اُس نے اپنے اور اماں بی کے بینک بٹلیس کا اندازہ کیا۔ ایک
 سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں اُسے بسوں کے دھکوں وقت کی خرابی اور آخر میں آج
 کے دلدوز اور عبرت آموز واقعہ کا خیال آیا اور اُس نے لاشعوری طور پر اُن کے کوٹ کو
 اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور سوچتی ہوئی کہنے لگی۔ ”مشورہ تو آپ کا بہت مفید ہے اور
 اسی نوے ہزار بھی بہت مشکل مرحلہ نہیں مگر قیامت یہ ہے کہ گاڑی لوں تو ڈرائیور بھی
 رکھوں؟“

”تا کہ وہ آپ کو گاڑی سمیت لے اڑے۔“ اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

پھر پیشانی پر ہاتھ مار کر بولے۔ ”آپ بھی عقل سے پیدل ہی رہیں۔ ذرا بتائیے بھلا
 اگر گاڑی خرید کر ایک عدد دروازے پر بھی رکھا جائے تو رقم ضائع کرنے سے فائدہ! بس
 کا ڈرائیور اتنا برا تو نہیں ہوتا بھلا؟“

اس سلسلے میں علی کے مشورے اور اصرار پر اُس نے یہ طور خاص اپنی پرنسپل زیب النساء بیگم سے اجازت لے لی تھی۔ بعد میں علی بھی کالج میں ایک دن آکر ان سے ملاقات کر گئے تھے۔ بقول علی کے وہ اُن کی بہت قدر دان بن گئی تھیں۔ ویسے انہوں نے اپنے طور پر کچھ خاص چھان بین کے بعد اور ضروری معلومات کے ساتھ علی کے اہل اقدام کو سرابا تھا اور انہیں یہ خوشی رانی کو ڈرائیونگ سکھانے کی اجازت عنایت کی تھی۔ ان کے خیال میں علی قابل اعتبار شخص تھے اور یہ ذمہ داری کا کام بہ حسن و خوبی ادا کرنے کے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ انہیں فون پر رابطہ قائم کر کے کالج ٹائم کے بعد رانی کو یہاں رہنے کی اماں بی سے اجازت دلوانا چنداں مشکل نہ لگا۔

دراصل صاحب زادی زیب النساء بیگم رانی کو اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز رکھتی تھیں اس لیے اُس کے شوق اور پھر اس مشغلے کی افادیت کے پیش نظر با آسانی رضا مند ہو گئی تھیں۔ چنانچہ چاندیوں نے ”قصر دیدار“ کے عقبی ہموار میدان اور پھر پائیں باغ سے مصنوعی جھیل کے ساتھ ساتھ مل کھاتی سرمئی سڑک پر ڈرائیونگ سیکھنے کی اجازت دے دی تھی۔

رانی نے اپنے اس مشغلے کا تذکرہ صاحب زادی افروز جہاں اور شاہ جہاں سے بھی کیا تھا۔ انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اکثر جب وہ جھیل کے کنارے کنارے علی سے گاڑی چلاتا سیکھ رہی ہوتی تو وہ دونوں کہیں نہ کہیں اپنی جھلک دکھا باتیں۔ اُس کی موجودہ مصروفیت کو اماں بی نے بھی اعتراض کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اور شرمین تو بہت خوش اور گمن تھی۔ گھر میں ایک عدد گاڑی کے آجانے کا خیال ہی بہت کد کد اپنے والا تھا۔

اسی ہلکی پھلکی مصروفیت اور حسین صبح و شام کے چکر میں تقریباً دو ماہ کی مدت تمام ہوئی اور علی کی کوششوں نے رانی کو ایک کار آمد ہنر سے بہرہ مند کر ڈالا اور رانی نے

اگلے ڈیڑھ دو ماہ ہوا کی مانند اڑ گئے۔ اُن دونوں کے درمیان ایسی زیر و سب اڈ رائیڈنگ اور فرینڈشپ ہو گئی جو شاید عام دونوں میں ایک صدی بھی قائم نہ ہو سکتی تھی۔ سخی منی سی معصوم پری کی مانند رانی یوں علی کے دل کے کسی خالی گوشے میں چھپ کر جرم کر بیٹھی تھی کہ وہ بہانے بہانے دن میں ایک دو بار ضروری اُسے دیکھ ڈرائیونگ سکھانے چلے آتے۔ اُن کی اور رانی کی عمر میں بارہ تیرہ برس تو ضروری فرق حائل تھے اور باوی انگڑی میں وہ انتہائی سنجیدہ متین خاموش سی طبیعت اور باوقار شخصیت کے مالک لگتے تھے مگر اندر سے جیسے شریہ حاضر جواب لطیفہ گو اور فحش مکھنغ یہ رانی ہی جانتی تھی۔ اُن کی موجودگی میں رانی ہستے ہستے بے حال ہو جاتی اور وہ ہنسنا ہنساتے بیزار نہ ہوتے۔

ہنستی ہنسی میں وہ گاڑی جیسی مصیبت چلاتا خوب سیکھ گئی۔ رفت رفت اپنے جلدنا نروس ہو جانے والے حواس پر کنٹرول کر کے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ تنہا گاڑا ڈرائیو کرنے اور کھلی سڑک پر چلانے کے لائق ہو گئی۔ لیکن یہ ساری مدت عجیب سرشاری اور سرخوشی کے انمول احساس کے ساتھ گزری۔

بھائی بھی انہوں نے تھی۔ ظاہر ہے یہ ان کی نیک نیتی اور بے پناہ خلوص ہی تھا ورنہ انہیں ان لوگوں سے کسی طرح کا مطلب یا لالچ تو نہ تھا!

رانی کو ذرا سوچ تک سکھا کر جس بے بہا خوشی اور سرشاری کا احساس علی کو ہوا تھا۔ یہ بات ان کا دل ہی جانتا تھا۔ انہیں ان تینوں ماں بیٹی سے کچھ قدرتی انس اور ہم دردی «علی تھی۔ رانی کے ہر روز کا لالچ آتے جاتے اور پڑھانے کو وہ قدرتی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر بس میں آنا جانا اور گھنٹوں بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں گھڑے رہنا بہت محسوس اور تکلیف دہ لگتا تھا۔ اتفاق سے پہلی مرتبہ جب اس نے ان سے الٹ مانگی۔ تب بھی اسٹاپ پر پریشان گھڑی تھی اور دوسری دفعہ بارش نے خیل پہ دھلا کر دیا تھا۔ اس کی تکلیف کا احساس علی کے لیے سوہانہ روح بنا ہوا تھا۔ یہ چھوٹی موٹی سی لڑکی پہلی نظر میں ان پر جانے کیا سحر کر گئی تھی۔ بری سی کسر اماں بی سے ملاقات کے بعد نکل گئی۔ انہوں نے تقریباً دنیا بھر کی سیاحت کر ڈالی تھی مگر ایسے بے ریا اور مکر و فریب سے آگاہ لوگ کہیں نہ ملے تھے۔ شرمین کی معصومیت اور شونہوں پر تو وہ دل و جان سے مذا تھا۔ انہی تمام احساسات نے مل جل کر انہیں ان تینوں ماں بیٹی سے بہت قریب کر دیا تھا اور وہ دل ہی دل میں ان تینوں کے لیے بڑے خوش آمدید فیصلے کر چکے تھے۔

جس روز رانی کو ذرا سوچ تک لائسنس ملا خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ نکلتے تھے۔ بے پایاں مسرتوں کے احساس سے اس کا رواں رقص کر رہا تھا۔ کالچ نامم کے بعد وہ سیدھی افراد زجہاں اور شاہ جہاں سے ملنے جا پہنچی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ادنیٰ میں سب سچے دل سے شریک تھے۔ ان دونوں سے خوب خوب مبارک باد اور مبارک و صول کی۔

جاتے جاؤں کی یہ خوب صورت ذلت بھی اس کی مسرتوں میں شریک تھی۔ موسم برساتی گرم۔ فضا میں ہوا تیس سب اپنی اپنی لگ رہی تھیں جیسے اپنا تیس ہر۔

چمکے کا جوتو ذکر کے کسی نہ کسی صورت ایک حد دیکھ کر ہینڈ گاڑی خریدی ڈالی۔ یہ قول علی سینڈ ہینڈ تھی۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ ظاہر انہوں نے کو ایک سچ کی سینڈ ہینڈ گاڑی دکھلا کر اس کی پسند پونہی۔ تو اس نے گولڈن کلر کیا اور علی نے ایک بیغے کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ یہ سفید جھوٹ بول دیا "تمہاری گاڑی گولڈن کروادی گئی ہے۔"

سینڈ ہینڈ کی آڑ میں انہوں نے قیمت اتنی کم اور بے ضروری بتائی تھی کہ را زیادہ مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یوں بھی جب سے اس نے سروس کی تھی اخراج کے لیے ابو کی طرف سے آنے والی رقم کا بہترین مصرف نکل آیا تھا۔

علی نے خیر خواہی کی حد کر ڈالی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ درحقیقت اندر ہی اندر انہوں نے کس طرح بے رانی کی مشکل حل کر ڈالی تھی۔ خود رانی فرشتوں تک کو اصل حقیقت کا احساس نہ ہو پایا۔ وہ اس خیال سے بے اندازہ خوش تھیں کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ اپنی کوشش اور محنت کا ہی دراصل انسان کی بے پایاں خوشیوں کا موجب ہوا کرتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ آج کل بہت خوش اور مسکون رہتی۔ بات بے بات ہنسی رہتی۔ اسے یوں محسوس جیسے اپنی آج تک کی زندگی میں اب خوشی اور طمانیت کا احساس اسے منہوف کر رہا ہو۔ خوشیوں اور مسرتوں کا اصلی مفہوم اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ اس کے پناہ اطمینان اور خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سواری کے معاملے وہ خود کفیل بھی ہو گئی تھی اور احسان مند بھی نہ ہونا پڑا تھا۔

علی کی احسان مندی بھی تھی کہ کبھی اس کے بچے باپ نے بھی اس کی تکلیف اور ہر روز بسوں میں دھکے کھانے کی پروا نہ کی تھی جب کہ علی نے علی سے اس کا ساتھ دیا تھا اور اپنا قیمتی وقت بچا کر اسے ذرا نیوٹنگ سکھائی تھی بلکہ یہ

”واہ! یہ کیا شرط ہوئی۔“ رانی منہ بنا کر بولی۔ ”آپ کو تو آج مجھے شاباش دینی چاہیے تھی اور مضائقہ کھلانی چاہیے تھی بلکہ اندوہی سیدھی شرطیں عاید کرنے گئے۔“

”پہلے تم یہ معمولی سی شرط تو پوری کرو۔“ وہ اسے تاؤ دلاتے والے انداز میں لے۔ ”پھر ڈیڑھ روٹن شاباش اور منوں مضائقہ کھالینا۔ ویسے اگر اس شرط سے ڈر لگ رہا ہے تو پھر..... چھوڑ دیتے ہیں۔“

”جی نہیں۔“ وہ حسب توقع لڑنے مرنے پر تیار ہو گئی۔ ”میں اتنی بزدل اور ہلچل نہیں ہوں کہ اتنی سی بات پر خوف زدہ ہو جاؤں۔“

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گاڑی کا رخ ہل کی طرف موڑ لیا۔ علی کی غصی اور بھی بڑھ گئی۔ اس کا کام کر گئی۔ حالاں کہ اندر سے اچھی طرح جانتی تھی کہ علی صرف اسے ستا کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اُن کا مقصد تھوڑی سی چھین چھاڑ کے سوا کچھ نہیں ہے مگر اس وقت اسے اُن کی بات تیر کی طرح لگی اور وہ گولے کی طرح اڑ گئی۔

گنگائی نہر کے اوپر بنا ہوا یہ میل غیر معمولی اونچائی تک اٹھا ہوا تھا جس کی گہری آرائی اور چڑھائی کے دونوں سمت شیشم اور برگد کے گھنے اور ستار درخت کھڑے تھے۔ اُن سے کچھ فاصلے پر نواب فیملی کی اہلیانِ سرسبز و شاداب اراضی میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ کھیتوں اور ہریالے باغات کے سلسلے کو اسی نہر سے لگنے والی ننھی منی گنگائی ندیاں سیراب کرتی تھیں۔ مجموعی طور پر یہ مقام بہت ہی دل کش اور پرسکون تھا۔

نہر کے کنارے کنارے چند عورتیں گھڑے سروں پر رکھے چلی جا رہی تھیں۔ ان کوار ہواؤں کے جھونکے اُن کی رنگ برنگی پٹریاں اڑائے لیے جا رہے تھے۔ علی ان کی شرارت سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہل سے فاصلے پر قریب میں کڑی روک کر کھڑے ہوئے گئے۔ وہ پہر کا سناٹا ہونے کی وجہ سے کھیت کھلیاں اور

لہجے میں سرگوشیاں کر رہی ہوں۔“ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم اکیلی نہیں ہو۔“

”قصر دیدار“ سے نکل کر وہ بجلی اسپڈ میں دائیں موڑ پر آئی تو سامنے سے علی اسٹریڈ بڑھ گئے چلے آ رہے تھے۔

”یہ آپ میرا لائنس لیے کہاں گھوم رہے ہیں؟“ رانی نے اُن کے برابر آ کر شوق سے دریافت کیا۔

”ابھی آخری ٹرائی باقی ہے محترمہ!“ انہوں نے بڑے رعب سے جواب دیا۔

”کیوں؟ کیا اب مجھے کوئی رشوت بھی دینی پڑے گی؟“ رانی نے اُن کے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”رشوت.....؟“ وہ دھیرے سے ہنسنے لگی۔ ”رشوت تو خیر نہیں کہہ سکتیں آپ نہ ایک آخری آزمائش ضرور کہہ سکتی ہیں۔“

”واہ! یہ کوئی بات ہی نہ ہوئی۔“ رانی چپک کر بولی۔ ”کبھی ٹرائی کہتے ہیں آزمائش۔ یہ کیوں نہیں صاف کہتے کہ آپ کو ابھی میرا بھروسہ ہی نہیں ہے۔“

”ارے..... ارے..... ایسی بدگمانی بھی اچھی نہیں۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

”تھوڑا سا تمہارا امتحان مقصود ہے۔ اس کے بعد یہ لائنس تمہارا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ بیکار رو نے بیٹھ گئیں۔“

”اللہ نہ کرے کہ میں روؤں۔“ وہ جھنجھکیاں مانی گئی مگر مزید جھڑپا نہیں چاہا۔

اس لیے سلع کے لہجے میں پوچھا۔ اچھا بتائیے کیا شرط ہے آپ کی؟

”وہ..... سامنے نہر کا اونچا ہل دیکھ رہی ہونا!“ علی نے سامنے اشارہ کر بتایا۔ ”بس وہاں سے تین مرتبہ گاڑی لے چڑھو..... اور..... اترو لائنس تمہیں جائے گا۔ اور یہ بھی.....“ انہوں نے کھڑکی کے شیشے کے پیچھے سے اُسے ڈرائیونگ لائنس اور کوڈ بک دکھائی۔

گھیارے سستان پڑے تھے۔ کبھی کبھار کوئی آتا جاتا دکھائی دے جاتا۔ رانی کی دوسری طرف سے پل بھر کے لیے پل کی انتہائی بلندی پر نمودار ہوئی اور بڑا اعتمادی کے ساتھ پل کے قریب سے اڑتی چلی گئی۔

انہوں نے ہاتھ ہلا کر شاباش دی۔

دوسرا راؤنڈ بھی بہ خیر و عافیت مکمل ہو گیا۔ رانی ان کی طرف بالکل بھی متوجہ تھی۔ یہ ظاہریوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ پوری طرح ذرا نیوٹنگ میں منہمک ہو۔ تیسرا راؤنڈ پر جیسے ہی وہ پل کی چوٹی پر نمودار ہوئی پل کے حواس جیسے معطل ہو کر رہ گئے۔ دیر کے لیے ان کا دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی کا رخ کے بجائے درختوں کے ٹھنڈ کی طرف ہو گیا۔ ونڈ اسکرین کے پار سے رانی کا دھواں چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ ان لمحات میں حواس کھو بیٹھی تھی ورنہ ہوش منہ حوصلے سے کام لیتی تو اس خطرناک سچویشن پر بروقت قابو پاسکتی تھی۔

یوں لگا جیسے پل کے جسم کا ہر عضو مفلوج ہو کر رہ گیا ہو۔ وہ چلا کر اسے چاہتے تھے کوئی ہدایت دینا چاہتے تھے مگر حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔

گاڑی ایک زوردار آواز کے ساتھ شیشم کے درخت سے ٹکرا کر رُک گئی۔ سنائے میں یہ آواز دُور دُور تک پھیل گئی۔

پل اپنی گاڑی سے بے قرار روح کی طرح نکل کر دوڑتے چلے گئے۔ پیشانی سے خون کی گرم گرم دھاریں بہ رہی تھیں۔ اس کا آخری احساس یہ تھا اس پر جو کائے بے تابلی سے پکارے جا رہا تھا پھر اس کا دماغ عمیق گہرائیوں میں چلا گیا۔

چند لمحوں کے اندر اندر وہ ہوش و حواس سے بے نیاز ہوتی چلی گئی۔



اس سانحے کو گزرے کتنے دن بیت گئے تھے کتنے کھٹے ہوئے تھے یا پھر وقت لپ گزیاں آگے جا پہنچا تھا رانی اس امر سے بے خبر رہی۔ وہ کہاں ہے! اسے کیا ہوا! اس کے لیے کون کتنا پریشان ہوا اور اس کے ساتھ کیا کیا گزری؟ وہ ان تمام لپ سے بے نیاز و غافل تھی۔ لہو بھر کے لیے اس کی آنکھ کھلی تو بچ بچ میں نہ آنے اور ت حال دکھائی دی تھی اُسے۔ اُس کا اپنا گھر تو نہیں تھا وہ! کسی کی بیش قیمت اماں اور لوازمات سے نئی سجائی خواب گاہ تھی وہ۔ اُس کی کلائی کی رگ میں تھن سائی کی ٹوک بری طرح چھ رہی تھی۔ معا اُس کی نگاہ کھو سکتی ہوئی سامنے ایک لپ پر ہم کر رہ گئی۔ جہاں پل نیم دراز تھے اور ان کی پشت پر شاید وہ صاحب زادی اُجاہاں ہی تھی جو پل کی گردن میں بائیں ڈالے ان پر جھکی کچھ کہہ رہی تھی اور پل اس سے سن رہے تھے۔

پل کے پل یہ تصویر اس کے سامنے آئی۔ اُس نے اُن کو آواز دینے کے لیے اُجاہاں کی پوری قوت صرف کر ڈالی مگر آپس میں خشکی سے جڑے ہوئے لب کھل گئے پکار اندر کی اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ ذرا اسی دیر میں دوبارہ اندھیروں میں گئی۔

شرمین نے بڑی محبت اور عقیدت کے احساس سے مغلوب ہو کر بہن کی پیشانی کو بوسہ دیا پھر آنکھیں پونچھتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ رانی نے دونوں پر ایک مسکراتی لہر ڈالی اور خود کو زندہ سلامت پا کر پُر سکون انداز میں دو بارہ آنکھیں منوعد لیس مگر فوراً علی اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ کسی نے اس کا ہاتھ پہلو سے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا تھا۔

”ارے۔۔۔ آپ!“ اس کے منہ سے مدھم سی چیخ نکل گئی۔

علی کی سرخ سرخ آنکھیں اور نستا ہوا چہرہ دیکھ کر شروع سے آخر تک تمام باتوں سے اذ سر نو یاد آتے چلے گئے۔ ساتھ ہی وہ جاگے لمبے کا عجیب و غریب منظر ہٹم تصور میں ابھرا گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

وہ کچھ نہیں پارتی تھی کہ وہ سب اس نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا یا نہ ہوئے بیمار ذہن کی کرشمہ سازی تھی! محض کوئی خیالی تصویر یا پھر کج کج کی حقیقت تھی وہ فیصلہ نہ کر پاتی کہ اس نے سنا۔ علی مبہم لہجے میں بڑی بے تانی سے پوچھ رہے تھے۔

”اب۔۔۔ تم کیسا محسوس کر رہی ہو رانی!“

”اچھی ہوں۔“ وہ بھیگی سے ہنسی ہنس دی۔

”شکر ہے خدا یا۔“ علی نے طمانیت کا ایک گہرا سانس کھینچا اور ہیڈ کے پاس سے ہاتھ کرکری پر جا بیٹھے۔

رانی کے پوہی طرح ہوش میں آتے ہی پورے گھر میں جیسے خوشی اور سکون کی ایک لہر سی گھوم گئی تھی۔ ماسی مریاں جسے اماں بی نے اب مستقل اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا دوڑی دوڑی آئی اور چٹا پٹ بلائیں لے کر ڈھیروں دعائیں دینے لگی۔ پھر جلدی سے گئی مرچیں، لہسن، پیاز کے چھلکے اور جانے کیا کیا اٹھالائیں اور منہ ہی منہ میں کچھ

اگلی بار ہوش آنے پر اس نے خود کو اپنے کمرے کے جانے پیمانے ماحول پایا۔

بہت دیر سے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کانوں میں بڑے زور و شور سیٹیاں بجا رہی ہوں یا پھر وہ کسی بہت بڑے ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہے اور۔۔۔ انجن سیٹیاں بجاتے شور کرتے گڑ گڑ کرتے گزر رہے ہوں۔ رفتہ رفتہ وہ تیز دم گڑا ہٹ عجیب بے ہنگم شور میں بدل گئی۔ شاید بہت سارے مسافر آپس میں جھگڑنے میں مصروف ہو گئے تھے جو غالباً پولیس کے آجانے کی وجہ سے پُپ گئے اور بلا آخر ان کی چیخ و پکار کھینچوں کی ہلکی ہلکی جھنجھناہٹ میں تبدیل ہوتی اور۔۔۔ رفتہ رفتہ یہ جھنجھناہٹ بھی ختم ہوتے ہوتے بالکل ختم گئی۔

اس نے گویا کسی بھیا تک۔۔۔ اور۔۔۔ طویل خواب کی بھول بھلیوں سے آ کر ایک لمبی جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔

اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر شرمین چیخ کر اس سے پٹ گئی۔ عجیب و غریب مٹھو لینے والا سماں تھا وہ بھی! اماں بی کی سسکیوں اور ہنگاموں کے درمیان اسے مانوسیت اور اطمینان کا بے پایاں احساس ہوا۔

گزارا ہوا واقعہ ذہن میں پوری طرح اُجاگر ہونے لگا تاہم مجموعی کیفیت سوئی سوئی سی لگ رہی تھی۔ ہاتھ پیر ہلانے جلانے کو جی چاہ رہا تھا نہ بولنے کا لگ رہا تھا جیسے اپنے تمام احساسات اور خیالات سمیت کسی خول کے اندر بندہ ”شمسی چاند! تم کچن میں چلی جاؤ اور اپنی آپنی کے لیے سوپ گرم کر۔ آؤ۔ میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں۔“

اماں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں شرمین کو ہدایت کی اور خود جلدی وضو کرنے چل دیں۔

”ایسے تو مت کیسے علی بھائی!“ شرمین سے رہانہ گیا۔ وہ درمیان میں بول

ی۔

”اگر سچ کہا جائے تو آپ کی بے ہوشی سے سب سے زیادہ آپ ہی پریشان ہوئے اور دن رات جاگ جاگ کر تیار داری بھی کرتے رہے۔ مجھے اور اماں کو تسلی کتنی بھی دیتے رہے۔ آپ کے حوصلہ دلاتے رہنے سے تو ہمیں بھی سہارا ہوا اور نہ خیر نہیں کیا ہوتا!“

”سب کیا دھرا بھی تو میرا ہی ہے بچے!“ علی نے اُسی موڑ کے تحت جواب دیا۔
”اگر میں ہل سے اترنے چڑھنے کی شرط عائد نہ کرتا اور یوں ہی اُن کا لائسنس دے دیتا تو یہ تو بت ہی کیوں آتی؟“

”اب جانے بھی دیجئے علی بھائی!“ شرمین نے پھر رانی کی طرف دیکھ کر بڑی فراخ دلی سے جواب دیا۔ ”قسمت میں ایسا لکھا تھا تو ہو گیا ورنہ آپ نے تو پوری طرح آپ کی کوڑا ٹیوٹنگ سکھا دی تھی۔ آپ تو خود ہر وقت آپ کی تعریف کرتی تھیں۔“
”جس بھی! یہ سچ ہے کیا؟“ علی نے یقین نہ آنے والے انداز سے رانی کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تو سمجھا تھا مجھے برا بھلا کہنے کے سوا آپ کو کوئی کام ہی نہیں ہے۔“

رانی نے اس دفعہ بھی خاموشی میں عافیت سمجھی۔

دراصل اس کی طبیعت ابھی تک پوری طرح سیٹ نہیں تھی۔ دماغ اور جسم میں سناہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی وقت اماں بی شکرانے کے نقل ادا کر کے کمرے میں واپس آ گئیں اور رانی کے قریب بیٹھ کر بیٹھ گئیں۔

باتوں کا موضوع بدل گیا اور علی نے پُپ سادھ لی۔



پڑھتے ہوئے اُس کی نظر اُتارنے لگی۔

علی مسکرا مسکرا کر ساری کارروائی دیکھتے رہے۔ رانی نے تھک بار کر پھر آنکھیں بند کر لی تھیں مگر آج اُسے خاموشی سے لیٹے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر کوئی ہاتھ کرنے کا تھکی لگ رہا تھا۔ شرمین چھوٹی سی ٹرے میں سوپ کا پیالہ اور چمچ لیے آموچہ ہوئی۔ اُس کا شانہ بڑا کر کہنے لگی۔

”بھئی آپ اب پڑے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ بس اُنھ بیٹھے۔ بہت ہوگی ڈاکٹر زکی پوری ٹیم نے آپ کو مائل اور صحت مند قرار دے دیا ہے۔“

رانی کے خشک لبوں پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ ناچ گئی۔ علی کے اشارے سے شرمین نے پھر اصرار کیا۔

”پتا ہے اب آپ کے تیار داروں کے آرام کا وقت آ گیا ہے۔ علی بھائی۔ چارے تو ایک لمحہ بھی نہیں سوئے۔“

”اور۔۔۔ شرط بھی تو انہی بے چاروں نے پیش کی تھی!“ رانی نے آنکھیں کھول کر جھٹ سے یاد دہانی کرائی لیکن فوراً ہی شرمندہ ہو گئی۔ علی کے چہرے پر اُسے اپنے شدید گہرے اور واضح دکھ اور تاسف کے تاثرات گزرتے نظر آئے کہ اپنا جملہ بہت جلد سا اور بے محل معلوم ہوا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا زبان سے نکلی بات اور کمان سے نکلا چہ نا قابل واپسی ہوتا ہے۔ یہی مرحلہ یہاں بھی درپیش تھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔ ویری سوری۔“ علی گردن کو خم دے کر بڑی غمناک سی آواز میں بولے۔ ”بلکہ“ سوری“ تو بہت ہی چھوٹا سا مناسب لفظ ہے۔ بندہ ہر سزا اور ہر عطا کے لیے درخواست گزار ہے۔“

رانی پر گھڑوں پانی پر پڑ گیا۔ اُس نے زبان سے کوئی بات کیے بغیر شرمین طرف رخ پھیر لیا اور آہستہ آہستہ سوپ پینے لگی۔

تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولے۔ ”سب سے گہرا اور مہلک زخم تمہیں پیشانی پر آیا تھا جو ڈیلش بورڈ سے ٹکرائی تھی۔“

”اور..... یہ تمہاری دونوں کلاسیاں اسٹیرنگ کے درمیان بڑی طرح پھنس چکی تھیں جنہیں ”زنہ و سلامت“ نکالنے میں بڑی وقت کا سامنا کرنا پڑا۔“

”کیوں؟“ وہ اب تک یہ ضد تھی۔

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے لیکن وہ ہنستے ہی چپ ہو گئی۔ علی نے اس کی کیفیت پر غور نہیں کیا۔ جلتی ہوئی سگریٹ انہوں نے الٹا ٹرے میں بھائی۔ سنجیدگی سے بولے۔
 ”خدا انکو استہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو ہرگز معاف نہ کرتا۔ وہ تو شکر ہے تم نے زندہ بچ کر مجھے بچا لیا۔“

”کیوں؟“ رانی ایک ابرو چڑھا کر بولی۔ ”میرے بچے نکلنے سے آپ کے بچے جانے کا کیا تعلق؟“

اگلے دن شام میں علی نے پھر پتھر لگایا۔

اماں بی کسی کام سے انھیں تو اس نے علی سے پوچھا۔ ”ہم تو اب بہتر ہے۔ آ، سنا ہے کیسی گزری آپ پر!“

”تو گویا میں نے آپ کو بدحواس کر دیا۔“ رانی نے پھینکی سی مسکراہٹ :-
 پوچھا۔

”ہاں..... بلاشبہ۔“ انہوں نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔

"ہے!..... بہت بڑا اعلق ہے۔" وہ عجیب سی کیفیت کے تحت بولتے چلے گئے۔
 "دیکھو نائیل والی شرط تو میری ہی عاید کردہ تھی۔ بندہ اتم نے زندہ رہ کر میرے لواحقین پر ایک احسان عظیم کر ڈالا اور نہ میں نے وہیں پل کے قریب ایک شاندار تاج عمارت تمہارے لیے اور ایک کچا حمار اپنے لیے بنوانے کا نقشہ بھی دے دیا تھا مگر تمہارا کہ....."

"اچھا۔۔۔ تو آپ کے کوئی "لواحقین" بھی ہوتے ہیں؟ مگر آپ نے آج تک ہم سے تو تعارف کروانا تک پسند نہیں کیا۔" رانی نے ان کی بات پکڑ کر گلہ کیا۔
 "تعارف کیا؟" وہ لہک کر کہنے لگے۔ "آپ کی باقاعدہ ملاقات کراؤں؟"
 "عقرب۔ آپ ذرا جلد از جلد اس "بستر" سے توجہات حاصل کریں۔"
 "اور..... ہاں میری گاڑی؟" رانی نے اچانک پوچھ لیا۔
 "اودہ ظالم لڑکی۔" وہ اچھل کر بولے۔

"اُس کا تم نے پکڑ کر ہی نکال ڈالا تھا۔" رنچر کے لیے جمع کرادی ہے۔ وہ اچھا ہو گیا کہ ایکسٹنٹ سے قبل ہی لائنس مل چکا تھا ورنہ ایک نئی قسم کی دشواری سامنا ہوتا۔"

اس دن وہ جاتے جاتے اسے لائنس اور کوڈ بک دے گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد اماں بی اور شرمین نے اسے بتایا کہ جائے حادثہ بہ قریب ترین مقام "قصر دیدار" ہی تھا۔ یہ حالت مجبوری زیب القسا بیگم کی اجازت علی آسے وہیں اٹھالے گئے تھے۔ آسے بے ہوش پا کر وہ فوراً حرکت میں آگئی تھیں ایک کھنٹے کے اندر اندر بہترین ڈاکٹرز اور نرسیں بلوا کر ہنگامی طور پر چھوٹے ہسپتال کا سامان پیدا کر ڈالا تھا اور پوری تندی سے آسے پہنچانے کی سرگوشش کروا تھی۔ جب تک اُس کی حالت خطرے سے باہر نہ ہوگئی تب تک القسا بیگم نے خود پر غ

گویا حرام کر لی تھی جب سے اسے اماں بی کے حوالے کیا تھا ہر کھنٹے دو کھنٹے کے بعد اُن پر اس کی خیریت معلوم کرتی رہتی تھیں۔ یہی حال افروز جہاں اور شاہ جہاں کا تھا۔ ان سب لوگوں کی فکر مندی اور خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ اس دوران کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے لیے تھے۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ اس معاملے میں زیب القسا بیگم نے علی کی بھی ایک نہ سنی تھی اور اُن کی یہ دلیل صاف رد کر دی تھی کہ رانی کو ایکسٹنٹ چوں کہ ان ہی کے لائیبلی پن کی وجہ سے پیش آیا اس لیے تمام ہرجانہ بھی علی خود برداشت کریں گے۔ یہ تمام تفصیلات جاننے کے بعد رانی دیر تک خاموش لیٹی ساری باتوں پر غور کرتی رہی۔

علی درحقیقت کون ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ اُن کا پس منظر کیا ہے؟ یہ تمام سوالات روز اول کی طرح جب اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی ہنوز جوں کے توں پر دے میں تھے۔ ان سوالات کے جوابات پوشیدہ رکھنے میں یہ ظاہر کسی کی کوشش کو دخل بھی معلوم نہ ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نقاب کشائی کی کسی کو کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہو سکی تھی۔ اماں بی بہت ہی سیدھی سادی مگر یلو ٹاپ خاتون تھیں۔ شرمین کو ان باتوں سے کوئی مطلب ہی نہ تھا۔ وہ گئی خود رانی! تو اُسے علی سے شائستگی کی حدود میں بے تکلفی کے بعد علاوہ ڈرائیونگ سیکھنے کے دوسرا کوئی خیال ہی نہ آیا کبھی۔

ہاں! اب ذہن کے پردے پر ضرور رہ کر جیسے بجلی کا ایک کوند اسالپک رہا تھا۔ وہ کھنٹوں صاحب زادی افروز جہاں اور علی کے درمیان کوئی کڑی یا چور راستا تلاش کرتی رہی مگر اس دقیق مسئلے کا حل نظر نہ آ سکا۔ یہ ظاہر تو علی اور نواب خلی کے درمیان اک ذرا سا بھی رعب و کھائی نہ دیتا تھا۔

کتنے دن تک رانی خود ہیں "قصر دیدار" کے مضامات میں علی سے ڈرائیونگ سیکھتی رہی تھی۔ جب تک تو کوئی قدر مشترک نظر نہ آئی تھی بلکہ اگر دیکھا جائے تو زب

استادری پر یقین کرنے کے لائق نہیں تھی لیکن کھلی آنکھوں نے جو دیکھا وہ بھی ناقابل تردید تھا۔

اس کے اچھے رہنے کا سب سے بڑا سبب نواب فیلی کی روایات تھیں اگر علی کے اراکم ان لوگوں سے بہت پہلے کی ہوتے یا پھر رانی نے ان کو کبھی "قصر دیدار" میں اتے جاتے دیکھا ہوتا تو پھر وہ اس حیرت انگیز منظر پر اس درجہ حیران بھی نہ ہوتی کہوں کہ ظاہر ہے کہ انسانی جذبات اور احساسات کو کسی بھی پیمانے سے ناپا تو نہیں جاتا لیکن حیران کن بات تو یہی تھی کہ علی کی شناسائی پر فیلی صاحبہ سے خود رانی کے طفیل ملی ہوئی تھی۔

آج کل اسے سوچے اور غور کرتے رہنے کا وقت خوب واقف ہوا تھا۔ کیوں کہ کالج سے اسے ایک ماہ کی چھٹی آرام کرنے کے لیے خود بہ خود بے دلی گئی تھی۔ گاہے گاہے افروز جہاں اور شاہ جہاں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم رہتا۔ دونوں اس سے خوب طویل طویل گفتگو کرتیں۔ ملی مذاق میں کئی منٹ ضائع ہو جاتے یہ رابطہ منقطع ہوتا تو رانی سوچوں کے گرداب سے نکلنے کے لیے ریکارڈ پلیئر لے کر بیٹھ جاتی اور زیادہ تر اپنا پسندیدہ گیت۔

”یو ہے باریاں تے نال کنداں شپ کے

آواں کی حواہن کے۔“

سختی رہتی۔ ماسی مریاں نے پورے نغمے کی اتنی تفصیل ترجمانی اردو میں کی تھی کہ اب رانی کے ساتھ ساتھ شرمین بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتی اور دونوں ہمیں کئی بار پلٹ پلٹ کر یہی گیت سنے جاتیں۔ اماں بی سارا دن اپنی سر پڑ میں اُلجھی رہتیں۔



انسانیکم سے ملی کا پہلا تعارف ہی رانی کی وجہ سے تھا۔ ورنہ جہاں تک رانی معلومات تھیں وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے اور پھر بعد میں بھی یہ صرف ان دو کے درمیان ہی رہا۔ نواب فیلی تک تو رانی کے خیال میں علی کی رسم ہرگز نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دوران بے ہوشی حادثے کے فوراً بعد وہ اُسے ”دیدار“ ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ تو کیا!! جو کچھ اُس نے عالم غنودگی میں دیکھا ایک حقیقت تھی!! صاحبزادی افروز جہاں اور علی کے درمیان کوئی رشتہ آس کی۔ ہوشی کے اڑتا لیس گھنٹوں کے اندر اندر قائم ہو چکا تھا!!

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہی منظر گھوم گیا وہ جھرجھری لے کر گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ہزار بے تکلفی اور اندراستیدگ ہونے کے باوجود وہ سے کھل کر پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ عین ممکن تھا وہ نہ امان جائے! آخر ان دونوں درمیان ایک مختصر سے عرصے کی دوستی ہی تو تھی جس کے بل بوتے پر وہ اتنی جرأت نہیں کر سکتی تھی کہ ان کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے بیٹھ جاتی۔ لیکن جانے کیوں! دل ہی دل میں کھٹکے والی ایک بے نام سی غلطی جی کو بھلی بھی نہیں سمجھتی تھی۔ کوئی جھجھکی کوئی کھٹک تھی ضرور۔ یوں جیسے جو کچھ اس نے دیکھا تھا نہ دیکھا تو اچھا تھا یا پھر..... جو کچھ دیکھا تھا کاش! وہ سوئے ہوئے ذہن کی کرشمہ سازی ہو محض ایک خواب ہوتا! ایک خیال..... ایک وہم ہوتا!! اگر یہ خیال ذہن سے نکلے نہیں نکل رہا تھا۔

شام کو ہی ملی اتنی ڈھیروں باتیں کر گئے تھے مگر آج ہمیشہ والی بات نہ لگتی تھی۔ نہیں اس کی اپنی سوچ تھی یا حقیقت؟ پوری طرح کوئی ایک بات پکنا چل رہی تھی۔ اتنی مدت میں جس حد تک وہ زیب النساء بیگم اور ان کے خاندان کے بارے میں جان پاتی تھی ان معلومات کی روشنی میں کم از کم وہ تو ایک ہزار سال تک بھی کسی

اُنہیں چھین کر سٹا کر خوب خوش ہوتی۔ گھر میں کوئی دوسرا تو اس کا ہم عمر تھا نہیں، اماں بی تو ہر بات میں جھڑک دیتیں، رانی اُس کی شرارتوں اور نادانوں پر کبھی ہنس دیتی، کبھی ایک آدھ دھپ لگا دیتی، اب لے دے کے ماسی مریاں رہ جاتی تھیں جن سے وہ ہر طرح کالا ڈبھی کر لیتی، تاز بھی اٹھوا لیتی اور اُن سے دل لگی کر کے اپنا جی بھی خوش کر لیتی۔ انہیں بھی جب دیکھو اپنی عینک سنبھال سنبھال کر کبھی اسے رنگ برنگے کپڑوں کی کتروں سے گڑیاں سی کرے رہی ہیں یا انہیں کپڑوں پر سلائی اور کٹائی سکھانے لگتیں۔ کبھی کبھی تو اماں بی کو بھی ہنسی آ جاتی جب وہ بڑے ارمانوں اور چاؤ سے چٹکنی بکئی مٹی گوندھتیں اور ننھے ننھے برتن اور چڑیاں طوطے بنانا کر دھوپ میں سکھاتیں اور شرمین گھنٹوں ان کے ساتھ ساتھ لگی رہتی اور ان کی تمام سرگرمیوں میں خود ان کا ہاتھ نہایا کرتی۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر اماں بی اپنے کمرے میں گہری نیند سوری تھیں۔ رانی کو کبھی دوپہر میں نیند آتی ہی نہیں تھی، کہاں بھلا فرمت اور چھٹی کے دنوں میں نیند۔ اس مسلسل آرام سے تو اب اُس کا جی ادبھ سا گیا تھا اور وہ بڑی سنجیدگی سے کالج دوبارہ جان کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

اس وقت بند کمرے میں طبیعت ابھی تو ایک کتاب اٹھا کر لان میں چلی آئی تھی اور یہاں کارنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

امتناس کے درختوں تلے گھنی چھاؤں میں ماسی مریاں اور شرمین بہت ساری کیلی مٹی کا ڈمیر لیے قسم قسم کے کھلونے بیٹاری تھیں لیکن کچھ سوچ کر اُس نے دونوں کو نہ کا اور نہ اُن کے مشغلے میں دخل دینا بلکہ خود بھی ایک لان چیئر پر جا بیٹھی۔

کھلونے بنانے لگاؤ نے کے دوران شرمین کی زبان پر اب پلے جاری تھی۔ بنانے کہاں کہاں کی ہانک رہی تھی۔ سچ ماسی مریاں کے قصے کہانیاں جاری و ساری

دن یوں ہی بے کیف سوچوں کی نذر ہوتے گئے۔ رات کو اکثر دونوں بہنیں کے سامنے والے پارک تک چکر لگانے کے بعد کچھ دیر سنسان سڑک پر ٹہلتیں۔ زیادہ گہری اور ویران ہو جاتی اور اوپر کھلی چھت پر آ جاتیں اور جب ٹہل ٹہل کر جاتیں تو کسی خالی گوشے میں بیٹھ کر ڈمیروں باتوں میں مصروف ہو جاتیں۔

پھر کسی لمحے میں خاموشی کو توڑتی ہوئی ماسی مریاں کی آواز دونوں کو چونکا جاتی "لاڑکیو! کھانے سے بھی غافل ہو گئیں کیا آج! چلو نیچے اتر دو اتنی رات گئی۔۔۔۔۔ چلی ہیں چھت پر کھوئے؟"

دونوں ہنستی ہوئی ایک دوسری کے پیچھے دم دم زینے اترتی نیچے آتیں سیدھی باورچی خانے میں چوکی پر آ بیٹھتیں ماسی مریاں ڈانٹتی جاتیں کھانا گرم جاتیں۔

اماں بی عشا کی نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر کب کی سو گئی ہوتیں۔ ماسی مریاں کے واپس آ جانے سے انہیں بہت ڈھارس اور آرام ہو گیا تھا۔ گھر کی تنہائی میں مریاں کا دم خیمت لگتا تھا۔ سارا دن اور رات کے ہر حصے میں گھر کے کسی نہ کسی کو سے اُن کی کھانسی یا باتوں کی آواز ابھر ابھر کر ان کی موجودگی کا پتا دیتی رہتی۔ شر

ہیں بھلا!

اُس کے انداز پر علی زور سے فہس پڑے۔ شرارت سے جواب دیا۔ ”کھانے بے کے متعلق تو کچھ عرض کرنے کی پوزیشن نہیں البتہ دیکھنے میں ”زبردست“ اور آفت“ چیز ہیں۔“

علی نے صاف طور پر ان کے خوب صورت جینکے جینکے نقوش اور جھلکتی ہوئی سرخ و ایدرنگت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ رانی نے فوراً بات پکڑی۔ ”اس کا تو مطلب یہ ہے کہ آپ خواتین کو بڑے غور و خوص اور توجہ سے ملاحظہ فرماتے ہیں!“

”اور کسی ”خاتون“ پر غور کروں نہ کروں۔“ علی نے بدست جواب دیا۔ ”مائی یاں کے رنگ روپ پر ضرور غور کرتا ہوں۔“

”کیوں جناب کیوں!“ رانی تیز ہو کر بولی۔ ”ان کے رنگ و روپ پر غور کرنے کی ہمت کس طرح ہوتی ہے آپ کو! صرف اس لیے تاکہ وہ بے چاری اکیلی رلا وارث ہیں؟“

”ارے توبہ..... توبہ..... معاذ اللہ۔“ علی کرسی سے اُچھل پڑے۔ ایک کان کی ہتھ کر جلدی سے بولے۔

”آپ تو بھی بہت خطرناک ہیں۔ میں تو کسی دوسرے نظریے سے کہہ رہا تھا۔ آپ نامعلوم کیا سمجھ بیٹھیں۔ لاجول ولاقوۃ۔ میری تو والدہ مرحومہ سے بھی زیادہ رگ ہیں۔“ پھر لمحہ بھر تک کر شرارت کے لہجے میں کہنے لگے۔ ”اور وہ..... لاوارث! کس طرح ہو گئیں؟ آپ کے ہوتے ہوئے..... ان کے تو خیر سے تین تین وارث یعنی آپ شرمین..... اماں بی۔“

رانی نے ایک گہری سانس لی اور تاسف سے بولی۔ ”ان بے چاری کا دنیا میں کون! نہ باپ..... نہ شوہر..... نہ کوئی بیٹا! بے چاری اکیلی بے بس اور تنہا

تھیں۔

اچانک ان تینوں کے درمیان علی آدمکے۔ گاڑی برآمدے کی سیڑھیوں پاس کھڑی کر کے وہ تیر کی طرح ادھر ہی چلے آئے۔ ان کو دیکھتے ہی شرمین نے سے بھرپور نعرہ لگایا اور مٹی میں ات پت ہاتھ لیے ان کی طرف لپکی۔

”علی بھائی! دیکھئے میں نے کیسے خوب صورت، خوب صورت کھلونے بنا دیے ہیں۔ ہتا ہے یہ سب مجھے مائی مریاں نے سکھایا ہے!“

”ہٹ گندی بچی!“ علی نے اُسے زور سے پھٹکارا۔ ”یہ مٹی میں ہاتھ دیئے ہے اور پروفیسر صاحب کو تو ملاحظہ فرمائیے اپنے خیالات سے ہی فرصت نہیں کا کریں۔“

”آپ آ تو گئے منع کرنے!“ رانی نے سکرا کر جواب دیا۔ ”جو آپ ہیں وہ تو نہیں ہو سکتی نا! اب دیکھنا یہ ہے کہ شرمین پر آپ کے کہے کا کیا اثر ہوتا ہے؟“

شرمین نے آؤ دیکھنا نہ تاؤ بھاگتی ہوئی گئی اور تیز تیز ہینڈ پپ چلا کر ہاتھ پا دھو کر واپس آ گئی اور آنکھیں منکا کر بولی۔ ”علی بھائی کے کہے کا یہ اثر ہوتا ہے۔“

”مائی مریاں بھی ہاتھ پونچھتی ہوئی ان دونوں کے قریب آ بیٹھیں۔“ حروف بنی ہوئی ہے حرفوں کی۔“ سب ہنسنے لگے۔

”مائی مریاں کے دیکھار کس ہوتے خوب ہیں مڑے دار۔“

رانی نے ہنسنے ہنسنے مائی مریاں کی طرف دیکھا جو اب کسی دوسرے کام کے جانے سے اپنی کٹھری کی طرف پل دی تھیں۔ علی نے نیچی آواز میں کہا تاکہ وہ نہ سکیں۔

رانی کے انہیں بہ غور دیکھ کر پوچھا۔

”مڑے دار سے کیا مراد ہے آپ کی؟ وہ بھی کوئی اچار چٹنی یا کھانے پینے کی

عورت!

”خیر۔۔۔ جانے دیجئے۔“ علی اُس کا سوڈ بدلنے کو کہا۔ ”یہ تو آپ بہر حال

کریں گی کہ ہیں وہ بہت خوب صورت اور حسین خاتون۔“

”اس میں کیا شک ہے!“ رانی نے اُسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مگر یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ جیسی خوب صورت اور حسین وہ خود ہیں

کے نصیب ایسے ہرگز نہیں ہیں۔“

”یہ آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟“ علی مکمل طور پر بحث کے موڈ میں آ گئے۔

رانی کے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر مای مریاں کو آتے دیکھ کر خا

اختیار کر لی۔ اُن کے پیچھے پیچھے شرمین چائے کی ٹرے اور کھانے پینے کی چیزیں

دوڑی چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر ٹرے اُس نے میز پر رکھی اور تیز آواز میں!

”میں ڈر رہی تھی کہیں آپ واپس ہی نہ چلے گئے ہوں۔ مای نے چائے بھی اُت

سے بنائی اور مجھے بھی کچن میں روکے رکھا۔“

مای مریاں جو ہنرے پر بیٹھی ہانپ رہی تھیں کہنے لگیں۔ ”ارے بیٹا اگر تم آ

تو مجھے بڑھیا سے یہ سامان اٹھایا جاتا!“ کوئی ان کی بات کا جواب بھی نہ دینے پایا

شرمین پھر بول پڑی۔

”علی بھائی! جلدی جلدی چائے پی لیجئے پھر میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں

آپ حیران رہ جائیں گے۔“

”شرمین!“ رانی نے اُسے ٹوکا۔

”کسی وقت چلی بھی بیٹھ جایا کرو۔ ابھی کسی نے چائے کو ہاتھ تک لگا یا

تمہاری فرمائشیں شروع ہو گئیں۔“

”ارے جانے دیجئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ علی نے ہاتھ ہلا کر

کہا۔ پھر شرمین کو تسلی دی۔ ”ہاں ہاں بیٹے! ابھی دیکھتے ہیں ابھی۔“ شرمین ا یکدم

دہارہ خوش ہو گئی۔

چائے کے دوران زیادہ تر مای مریاں ہی بولتی اور اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی

ٹیبل چلی کو خوش ہو ہو کر کھلاتی رہتیں جب کہ علی خوش ہونے اور تعریف کرنے میں

بہت فیاضی دکھا رہے تھے۔

چائے کے بعد شرمین برق رفتاری سے برتن سیٹ کر اندر لے گئی۔ واپس آئی تو

اُٹھ کر چپ چاپ اسی سست چل دیے جدھر اُس نے اشارہ کیا تھا۔ رانی جانتی تھی وہ

اُس جاکن کے بلندو بالا درخت پر بنے اُس گھونسلے کو دکھانے لے گئی ہے جس میں

اُس نے طوطوں کے بیٹے دیکھ رکھے تھے۔ آج کل اُس کی تمام پرتوجہ انہی بچوں کی

طرف رہتی تھی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد رانی دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی اور مای

ریاں گھاس پر بیٹھی بیٹھی گوار کی پھلیاں بنانے لگیں جو وہ کچن سے اٹھلائی تھیں۔ تھوڑی

دیر میں علی اور شرمین واپس آ گئے۔ شرمین بڑی بڑ جوش نظر آ رہی تھی اور زور و شور سے اپنی

”دریافت“ کی تفصیل سنارہی تھی۔ علی بڑی سنجیدگی سے نہ صرف یہ کہ سن رہے تھے

بلکہ اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

جب شرمین کی باتیں ختم ہو گئیں اور اُسے پورا اطمینان ہو گیا کہ کسی نے اُس کی

لگن پوری توجہ اور یک سوئی سے سنی ہیں تو وہ مطمئن ہو کر وہاں سے چل دی اور فوراً

لا ر پودوں کو پانی دینے میں مصروف ہو گئی۔ اب علی نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا

ہاتھ بڑھا کر رانی کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے بولے۔ ”خدا کا شکر ہے شرمین تو

لمسن ہوئی۔“

”خوش تو آپ بھی کم نہیں لگ رہے۔“

رانی نے دھڑے سے کہا مگر انہوں نے سن لیا۔ فلسفیانہ انداز میں بولے۔
 ”دراصل ہماری اپنی خوشی میں بچوں کی خوشی بھی پیچی ہوتی ہے۔ بچوں کو خواہ
 باش رکھنا بہت آسان ہے۔ بس ان کی بات توجہ اور دلچسپی سے سن لی جائے۔ وہ
 اہمیت کا احساس کر کے از خود مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں۔“

”ہاں جیٹا بالکل سچ کہتے ہو۔“ اس مرتبہ ماسی مریاں نے ذہل اندازی کی۔
 ”بچوں کو مطمئن کرنا بہت بڑا فن ہے جو ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔“

”اچھا آپ یہ کون سی ترکاری بنا رہی ہیں؟“ علی نے موضوع بدلنے کی خاطر
 سے پوچھا۔

”بیٹا یہ گوہار کی پھلی ہے۔“ ماسی مریاں نے فوراً ہی ان کی معلومات میں اضافہ
 کیا۔

”گوہار کی پھلی۔ میں نے تو کبھی نہیں کھائی یہ بڑی۔ نام بھی نیا لگ رہا ہے۔“
 رانی مسکرا دی۔ ماسی سوکھا سامنہ بنا کر بولیں۔ ”یہاں بھی کوئی نہیں کھاتا۔“

مجھے بہت بھلی لگتی ہیں۔ ہفتے میں ایک آدھ وفد اپنے لیے بنا لیتی ہوں۔ بیگم صاحبہ
 کبھی کبھار چکھ لیتی ہیں میرے ساتھ لیکن یہ دونوں تو خدا کی پناہ! خیال ہے جو ہاتھ
 لگا لیں اور وہ شرمین! ماسی مریاں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر بتایا۔ ”گوہار کی پھلی“
 بجائے کہتی ہی ”گوہار کی پھلی“ ہے اور ذور سے اعلان کر دیتی ہے۔ ”اسے تو بکھر
 کھاتی ہیں۔“

علی زور سے ہنسنے لگے۔ رانی منہ پھیر کے مسکرانے لگی۔ شرمین ان تمام باتوں
 سے بے نیاز زور و شور سے پودوں کو پانی سے نہلا رہی تھی اور جانے کیا سنگتاتی جا
 تھی۔

”ہا..... ہا..... بچپن بھی کیا انمول زمانہ ہوتا ہے۔“ ماسی مریاں نے بیٹھے

ایک فنڈا سانس بھرا۔ ”نہ کسی بات کی فکر نہ کسی سوچ کا گزر۔“
 ”جی ہاں..... یہ تو حقیقت ہے کوئی شبہ نہیں اس سچ میں۔“ علی۔ رانی کی ہاں
 میں ہاں ملائی۔

”ہاں میاں! ایک زمانہ ہم پر بھی ایسا گزرا ہے نہیں جانتے تھے کہ دکھ درؤ
 اکایف غم پریشانی اور مصیبت کس بلا کا نام ہے۔“ ماسی مریاں بولنے پر آئیں تو بولتی
 ہلی گئیں۔ ”ہم تھے اور ہنسی کی پھواریں تھیں۔ ہم تھے اور قہقہوں کی برساتیں تھیں۔
 اس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھتی ہے اسی طرح ہم بھی
 اندھی کو ایک دل کش نواز اور ایک مسلسل قہقہہ سمجھتے تھے۔ نہیں معلوم تھا اس وقت کہ
 اندھی دراصل مصیبت و آلام اور دکھوں آنسوؤں کا گڑھ ہے بلکہ ایک ایسا آتش کدہ
 ہے جس میں غریب کے آنسو مسلسل تمام ہو کر گرتے رہتے ہیں برسات کی طرح ٹکریہ
 آتش کدہ بجھنے میں نہیں آتا۔ دھیرے دھیرے غریب کے تمام ارمان تمنائیں اور
 آرزوئیں سگ سگ کر اسی کے اندر جل کر بھسم کر ختم ہو جاتی ہیں اور بجائے ارمانوں
 کے سر تہ بن جاتی ہیں.....“

علی اور رانی حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ
 اُن وقت کس موڑ میں تھیں۔ تاہم رانی کبھی کبھار ان کی ایسی باتیں سن چکی تھی مگر علی کا
 بلا چانس تھا۔ وہ بڑی حیرت اور دلچسپی کے ساتھ ان کی ایسی فصیح و بلیغ گفتگو سن رہے
 تھے۔

وہ جیسے ہی چپ ہوئیں علی نے فوراً ان کی حوصلہ افزائی کی آپ کی باتیں تو
 ات کہری اور فکری انگیز ہیں..... معلوم ہوتا ہے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے
 پ نے!

”ارے میاں! ماسی مریاں بڑے دکھ سے ایک گہرا سانس بھر کر کہنے لگیں۔

ارتے انکھوں ستارے اپنی ذاتی ملکیت لگا کرتے تھے۔ پوری کائنات مختصر اور مکمل
 اور اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم لگا کرتی تھی۔ دراصل اُس وقت ہم دنیا کو ایک بچے
 کی نگاہ سے دیکھ کر یہی محسوس کرتے تھے کہ پوری دنیا ہماری ہستی اور ہمارا گھر ہے۔ باقی
 کچھ نہیں۔ ہماری کم سنی اور لاعلمی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جوں جوں بڑے ہوتے جائیں
 گے دنیا کے یہ دل فریب و خوب صورت چہرے کے رنگ بکھرتے جائیں گے اور نقوش
 بگڑتے جائیں گے۔ کاش! اس وقت اس حقیقت پر یقین ہوتا! یا پھر ہم بڑے ہی نہ
 ہوتے ہوتے! تو پھر اُن مصیبت و آلام کی صورت نہ دیکھنی پڑی جس نے بعد کو ہماری
 اندکی ہجران کردی اور ہمیشہ کے لیے سر جھکا کر چلنے پر مجبور کر دیا۔ ملی ماسی مریاں کے
 اتنے خوب صورت طرزِ بیان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تھوڑی دیر کو یہ بھی فراموش کر
 بیٹھے کہ رانی بھی اُن کے قریب بیٹھی یہ سب سن رہی ہے۔ انہوں نے آگے کو جھک کر
 ماسی مریاں کے بوڑھے شانوں کو تمام لیا اور بڑی سچائی سے کہنے لگے۔ "میں خواب
 میں بھی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ آپ اندر سے اتنی ڈکھی ہوئی ہیں اور۔۔۔ اور اتنی خوب
 صورت اردو کہاں سے سیکھی آپ نے! اور پنجابی زبان پر بھی مکمل عبور ہے آپ کو۔
 شرمین اور رانی تعریف کرتی نہیں تھکتیں! ماسی مریاں کے سرخ و سپید چہرے پر خوشی
 اور مسرت ہنسی بن کر بکھر گئی۔

"بس میاں! وہ بڑی فراخ دلی سے ہنس پڑیں۔" یہ سب وقت وقت کی باتیں
 ہیں۔ زمانے اور حالات کے تجھیڑے انسان کو کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنے پر مجبور رکھتے
 ہیں۔ یہاں بھی تھے کچھ۔ بن گئے کچھ۔ کل تھے کچھ۔ آج ہیں کچھ۔ ایک
 زمانہ تھا جب اپنی ہستی میں بیٹے تھے تو رہن بہن بول چال پنجابی تھی زمانہ بدلا حالات
 نے پلٹا کھایا تو عام اردو بھی نہیں بلکہ نوابی اردو سے واسطہ پڑا اور وقت نے وہی کچھ
 کہنے پر مجبور کر دیا جو حالات نے سکھایا تو میاں! یہ سب وقت وقت کی باتیں ہیں۔

"زندگی کو ہم نے کیا قریب سے دیکھا ہے بلکہ زندگی ہم سے ہمارا سب کچھ ایک جگہ
 سے چھین لے گئی تھی۔"

"بھلا وہ کیسے؟" علی نے سچ کے سچ لہجہ دیا۔

رانی نے ان دونوں کے درمیان کوئی دخل نہ دیا بلکہ چپ چاپ بیٹھی کان دینے
 رہی تھی۔ اب تو اسے بھی اک تجسس سا محسوس ہونے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے
 مریاں اپنے بارے میں کوئی اہم انکشاف کرنے والی ہوں مگر وہ صاف کی ہوئی ہری
 پھلیاں اپنے سامنے کھڑا کر اب چاقو سے کاٹنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ انہیں نہ
 حیرت کی پروا تھی اور نہ رانی کے تجسس کی بلکہ صاف محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اپنے آپ
 کو کوئی ہوئی ہیں۔ کچھ دیر تک ماحول پر ایک گہرا سکوت اور جامہ سناٹا طاری رہا جس
 ان لوگوں کی مدھم مدھم سانس ڈھنکی ڈھنکی رہی۔ پھر رفتہ رفتہ ماسی مریاں کی بڑبڑا
 قدرے بلند اور واضح ہونے لگی۔ وہ کسی کو بھلا کر کہہ رہی تھیں۔

"اللہ..... اللہ..... کیا کیا خوب صورتیاں اور حسن نمایا ہوا تھا ہماری چھوٹی سی
 میں شاید دنیا کی ساری رعنائی اور تمام دل فریبیاں وہیں سٹ آئی تھیں۔ سبز
 شاداب پتوں کے جھنڈ میں کوئل کوکتی تھی۔ گھٹکھور سیاہ گٹائیں جھوم جھوم کر
 تھیں۔ کلیاں کھلتی تھیں۔ پھول ہنستے تھے۔ باجرے کے ہریالے کھیتوں میں نغمہ
 بے شمار چڑیاں چہچہاتی تھیں۔ ہلکوں کے غول کے غول اڑتے پھرتے تھے۔ جنگل
 ست رتے پروں والے حسین و جمیل مور پر پھیلائے ناچا کرتے تھے۔ ہوا
 جھاڑیوں میں سرشام سرسرا نے والی اہلی ہوائیں ساری ہستی میں نکلتی پھرتی
 اور لہراتی بل کھاتی ندیا کا پانی چاندنی راتوں میں کھلی ہوئی چاندی کی مانند ٹھانسی
 کرتا تھا۔۔۔ ہائے۔ کیا مہانے زمانے تھے!! جو پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔
 ناشپاتی، امرود اور آم کے باغات سے لے کر آسمان کے چاند سورج اور جنگل"

جیسی جیسی ٹوٹ پھوٹ اور جوڑ توڑ رب نے نصیبوں میں لکھ دی ہوتی ہے وہ بہر حال پوری ہو کر رہتی ہے۔“

”مانسی میں آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“ علی نے بات کھما کر پوچھی۔

”تھی ایک پھولوں بھری وادی اور نفوس سے لب و زین ہستی۔“ انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔

”ابھی اسی ہستی کا ذکر کیا ہے اگر نام بہت ہی ضروری ہے تو اس کا نام ’را پور‘ سمجھ لو۔ ادھر بہاول پور ساڈر پتھی ایک چھوٹی سی ہستی۔ میری پیدائش بھی وہیں ہے۔ سارا بچپن وہیں گزرا۔ میں نے اس جہان رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں! وہاں نے بند کر لیں..... بس اتنی سی بات پر بابا نے کبھی نظر اٹھا کر یا جی بھر کر مجھے دیکھا۔ ہٹا نہیں رو دھو کر کس طرح پل بڑھ گئی۔ کیوں کہ کوئی بڑا تو کیا ’چھوٹا بہن بھائی‘ بھی نہ تھا۔ تنہا اکیلی اور اکلوتی اولاد..... سنی تھی اللہ میاں نے مجھ سے پہلے آٹھ بہن بھائی اور بھی عطا فرمائے تھے مگر مشیت ایزدی میں کسے دخل چند ماہ کے ہو ہو۔ سب داغ مفارقت دیتے گئے۔ آخر میں میں ہی ایک زندہ بچی مگر ایسا پچتا کس کام کہ پیدا کرنے والی ماں نہ رہے۔ لیکن میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوا۔“ وہ ایک لمحہ کور کئے اس ہستی میں ایک بہت بڑا بلکہ اس علاقے کا سب سے بڑا قبرستان تھا۔ آس پاس ساری چھوٹی چھوٹی ہستیاں کے لوگ اپنے مردے اس قبرستان میں لے کر آتے تھے میرے بابا اس قبرستان کے گورکن تھے۔ بہت سخت مزاج ’اکثر اور اپنے آپ میں کم رہنے والے بندے باہر کی دنیا سے انہوں نے اپنا واسطہ بہت کم کم بلکہ یوں سمجھو کہ ہونے کے برابر جوڑ رکھا تھا۔ سارا سارا دن کدال ہاتھ میں لیے اس قبرستان کے اندر اندر گھومتے پھرتے رہتے۔ ویسے تو اتنی وسیع و عریض جگہ کی دیکھ بھال اور دیگر کام کا، عی ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کی کڑیاں تھیں اور لو پر سے بابا کی اپنی افتاد مزاج.....

انوں مجھ سے بات نہ کرتے تھے۔ قبروں کی نگرانی ’ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری‘ گھاس پھوس اور ٹوٹنے پھوٹنے کی صفائی یہ سب ایسے کام تھے کہ وہ تمام دن مصروف رہتے پھر آس پاس کی کئی ہستیاں سے منسلک رہنے کی وجہ سے ہر روز ایک دو تین آجائیں بابا اور بھی زیادہ مصروف ہو جاتے۔

قبرستان کے چاروں طرف کچی مٹی کی ایک قد آدم چہارہ دیواری بنی ہوئی تھی تاکہ چھوٹے موٹے جانوروں سے حفاظت رہے اسی احاطے کے اندر ایک خاصا بڑا سا کشادہ مکان گورکن اور اس کے کنبے کے لیے بنا ہوا تھا۔ اسی کنبے گھر وندے کے در و دیوار تلے پیدا ہونے سے بچپن تک کے پھر لڑکپن سے آغاز جوانی تک میں نے ہنگاموں گھڑیاں اور زندگی کے لمحے تنہا کھیتے ’ہٹتے‘ روتے گزارے۔ بعض راتیں تو ایسی آتیں کہ بابا کوسوتے سے اٹھا کر بلوایا جاتا۔ جیسے ہی رات کے سنانے میں بہت سارے جوتوں کی چابٹیں ابھرتیں اور زور زور سے کھڑی بجتی ’بابا کتنی ہی گہری نیند ہوتے ہوتے اپنا صافہ سنبھالتے‘ آوازوں کا جواب دیتے ’اٹھ کر باہر چلے جاتے اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ صبح کا اُجالا چاروں طرف پھیل جاتا چیزوں پر چھبائی چیزیاں دانے دانے کی تلاش میں اُڑ جاتیں تب وہ واپس آتے۔

شاید دن رات مردوں میں رہتے رہتے بابا خود بھی اُن ہی جیسے بے حس بے خبر اور بے درد ہو چکے تھے یا پھر اپنی ذاتی زندگی کے لیے نے انہیں اندر سے اس قدر توڑ پھوڑ ڈالا تھا کہ وہ پتھر ہو گئے تھے۔ بچوں کا ہو کہ مر جانا اور پھر شریک حیات کی دائمی جدائی۔ یہ دردناک اُن کو ایک لاعلاج مرض بن کر چوٹ کئے پھر وہ تمام عمر کھل کر نہ ہنس سکے۔

یہ سب تھا مگر جوں جوں سمجھ آئی۔ میں یہ سوچ سوچ کر کڑھا کرتی اس تمام قصے میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا کوئی گناہ کوئی خطا کوئی جرم.....؟

کہ میں اس دنیا میں اکیلی نہیں ہوں بلکہ مجھ سے بے خبر اور لاعلم رہنے والے بابا میرے ہر اقدام سے آگاہ اور یا خبر دہتے ہیں۔ پھر اس ذات کے نتیجے میں بہت دن تک میں ہستی کا زخ کرنے کی ہمت بھی نہ کر پائی۔ قبرستان کے احاطے سے باہر نکلتی سرور مگر کچھ فاصلے پر ریت کے ٹیلوں پر آگے ہوئے بے شمار بیلو کے جھاڑوں سے پیلے پیلے کیے ہوئے نیلے توڑ توڑ کر اپنی اوڑھنی میں جمع کرتی رہتی اور جب اس شغل سے خزاں ہو جاتی تو تھک ہار کر واپس اپنے گھر لوٹ آتی۔

رائی جو بہت توجہ سے مای مریاں کی دلچسپ آپ بیتی سننے میں منہمک تھی چونک کر پوچھ بیٹھی۔ "آپ کو قبرستان میں ڈر نہیں لگتا تھا۔ قبروں اور سردوں سے ڈر کا ہے کا۔" مای مریاں بے پروائی سے فہم دیں۔ مجھ سے تو اگر کوئی پوچھے تو اپنی ساری زندگی کا سب سے زیادہ یادگار اور خوب صورت ترین زمانہ ہی لگتا ہے۔ بار بار ہاتھ ملتی ہوں کہ کاش! وہی شب و روز واپس لوٹ آئیں۔ میں دوبارہ چھوٹی ہو جاؤں اور اسی قبرستان میں قبروں کے آس پاس ماری ماری پھرا کروں مگر ایسا بھلا کسی کے ساتھ ہوا ہے جو میرے ساتھ ہوگا! بلکہ اب تو وہ وقت آچکا ہے کہ عمر کے اس آخری حصے کا کہ یہ ارمان دل میں لیے لیے قبر میں جاسوئیں گے۔"

"ارے تو یہ تو بے۔" علی جلدی جلدی دونوں کا تون کو چھو کر بولے۔ "آپ ایسی مایوسی کی باتوں پر خاک ڈالے۔ بس اپنی داستان حیات مکمل کیجئے۔ مجھے بہت اشتیاق پیدا ہو گیا ہے اور ادھر دیر بھی بہت ہو رہی ہے۔"

"سچ تو یہ ہے بیٹا!" مای مریاں نے رائی کی طرف دیکھتے ہوئے گویا اس کا سوال یاد رکھا۔ "ڈر یا خوف کس بلا کو کہتے ہیں؟ مجھے معلوم نہ تھا۔ بس اپنے آپ میں گمن اور مست و بے خود رہتی تھی۔ پھر سردوں اور قبروں کا ڈر کیا! دراصل آنکھ کھول کر وہی ماحول اور وہی فضا تھیں۔ کبھی تھیں۔ اسی قبرستان میں ہے۔ آٹھ نو بہن بھائیوں

میں کس غلطی کی سزا کاٹ رہی ہوں؟ آخر میرے بابا مجھے کس جرم کی پاداش میں بیٹی نہیں سمجھتے! انہیں احساس کیوں نہیں کہ میں محض ایک بیٹی ہوں! جو کچھ ہو گزرا اس میں اسی پروردگار عالم کی کوئی بڑی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ میں تو بے جرم و خطا سزا کی مستحق نہ تھی۔ مگر یہ سب باتیں بابا سے بھلا کون دریاقت کر سکتا تھا! لیکن ج پوچھو تو مجھے ان سوالوں کے جوابات کی کچھ ایسی جستجو اور پروا بھی نہ تھی۔ کم سنی اتنی سادہ اور سوجھیں اس درجہ معصوم تھیں کہ بابا کا ٹھنڈا ٹھنڈا رو یہ گراں گزرتا تھا! شاپی ذات کی کم مانگی کا احساس گوارا بن کر لگتا تھا! بلکہ کبھی کبھی ایسا خیال بھی گزرتا تو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیتی کہ شاید باپ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ اور یوں بھی بابا نے میری ذاتی ضرورتوں کو کبھی نظر انداز نہ کیا تھا۔ عید بقرعید پر اتنے جوڑے کپڑے رنگ برنگے آجاتے کہ سال بھر پہننے پہننے نہ پہنتے تھے۔

جب تک بہت ہی چھوٹی تھی بابا کے پیچھے میں بھی سارا دن قبروں میں ادھر ادھر ماری ماری پھرا کرتی۔ پھر جوں جوں شعور آتا گیا گھر کے کام کاج کی طرف متوجہ ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ میری دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا اور میں گھر کی جھاڑ پونچھ نیکانے اور دیگر گھریلو کام توجہ اور لگن سے کرنے لگی اور بہت جلد ان سارے کاموں میں ماہر بھی ہو گئی۔ گھر بہت کشادہ اور کچا تھا۔ باہر بھی چکنی چکنی مٹی کی کمی نہ تھی۔ اکثر فارغ وقت میں گھر کے در و دیوار لیپنے پونچھنے کے بعد کئی مٹی کے گارے سے چڑیاں طوطے اور کبھی توئے ہانسیاں گھاس بیک اور پیٹ پیا لیاں وغیرہ بنانے میں لگی رہا کرتی۔ اس مصروفیت سے اکتا جاتی تو گھر سے باہر نکل جاتی۔

کبھی کبھار قبرستان کے احاطے سے باہر کی دنیا دیکھنے کو چل دیتی۔ خوب صورت ہستی کے جاں فرزا نظارے دیکھتے دیکھتے ہی نہ بھرتا۔ ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے گھر لوٹی تو اس روز بابا سرور ذات ڈپٹ سے کام لیتے۔ تب مجھے اچانک ہی احساس ہوتا

کی منی منی قبریں تھیں۔ ایک طرف اماں پڑی ابدی نیند سو رہی تھیں۔ بابا ہر دم جھانک جھانک رہا تھا۔ منی برابر کرتے ادھر ادھر گھوما کرتے بھلا تم جانو ایسے میں کون ڈر سکتا تھا۔ آخر کو میرا وہاں پورا کتبہ موجود تھا! میری تو سہیلیاں وہی قبریں تھیں۔ سردی گرمی بہار و خزاں سارے موسم ان کے درمیان نکلتے۔

احاطے کے اندر بہت پرانے پرانے درخت بھی تھے۔ ان میں بہت سے پھل دار بھی۔ ہر موسم میں میرے حیرے آ جاتے۔ کھاتے کھاتے جی اُوب جاتا مگر اونچا لکھنا چھٹنا درامتی کا بیڑ مجھے سب میں زیادہ توجہ کا مستحق نظر آتا۔ میں سارے دن میں گھوم پھر کر بار بار اسی کے نیچے جا پہنچتی۔ امی کے کھنے کھنے کنارے میری کم زوری تھے اور میں بلا شرکت غیرے اس کی مالک و مختار تھی۔ اسی طرح کی بیٹا بے شمار یادیں ہیں۔ کیا کیا سناؤں تمہیں! کہاں تک سنو گے تم لوگ بلکہ شاید پریشان ہی ہو جاؤ مجھ پر بڑھی عورت کی بے تنگی راگنی سن کر۔ "مائی مریاں نے اک اداس مسکراہٹ سے اپنی بات مکمل کی۔



چھٹپٹ میں جو بھاگ بھاگ بستی جایا کرتی اور واپس آ کر بابا کی ڈانٹ پھٹکار سنا کرتی تھی تو جوں جوں بڑی ہوتی گئی بستی کے خیال سے دست بردار ہوتی گئی اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ خود بہ خود میں ایک دائرے کے اندر محو و ہوتی گئی۔ میں نے پورے طور پر یہ سمجھ لیا کہ گھر اور گھر کے آس پاس ہی رہنا میرے لیے زیادہ بہتر لگتا ہے۔ بابا بھی شاید مطمئن ہو گئے تھے پھر انہوں نے مجھے کبھی گھر کئے ڈانٹنے کی زحمت گوارا کرتا بھی ترک کر دی۔ مائی مریاں نے اپنی داستان حیات بیان کرتے ہوئے کہا۔ "اُس زمانے میں گھر سے باہر میری دلچسپی کامرکز امی کے بیڑ کے علاوہ قبرستان کے احاطے سے باہر ریت کے وہ ٹیلے تھے جن پر چھوٹے قد والی بیریاں اور ویلو کے بے شمار جھاڑ ہوا کرتے تھے۔ بیروں کے موسم میں سرخ سرخ کھٹ مٹھے بیر کھا کھا کر زبان سن ہو جاتی مگر نیت سیر نہ ہوا کرتی۔

اب میں پورے قد کاٹھ کی مکمل مریاں بن چکی تھی اور خوب بڑی بڑی لگنے لگی تھی مگر بابا نے مجھے ٹیلوں پر جانے کی ممانعت نہیں کی تھی شاید اس لیے کہ بستی سے اتنی دُور وہاں کوئی دوسرا ہوتا بھی نہ تھا۔ کبھی کبھار بستی سے بھولے بھٹکے مویشی لگھاس اور ہریالی کی تلاش میں دوڑتے بھاگتے ادھر آ نکلتے تو اُن کے تعاقب میں چرواہا بھی لاپتہ ہوتا۔ برساتا چلا آ رہا ہوتا۔ ورنہ تو جنازوں کے ساتھ آنے جانے والوں کے علاوہ

نہم ہی کسی کا گزران اطراف میں ہوا کرتا تھا۔

ایک بھری دوپہر یامیں میں حسب معمول ٹیلوں پر بیٹھوں رہی تھی۔ خوب صبح رنگت والے کپکے پکے بیٹھوں سے میرا دماغ ہر آن بھرتا جا رہا تھا۔ اب بہت دور سے میں نے آواز سنی میں بیٹھوں اور ہر جمع کرنا پیسوں دے تھے بلکہ اس مقصد کے لیے آواں لال رنگ کارٹھی رومال بنایا تھا اس رومال کو میں جھاڑیوں کے درمیان کسی صاف زمین پر بچھا دیتی اور اپنا گوبر مقصود توڑ کر اس پر ڈھیر کیے جاتی۔

اُس روز بڑی تیز دھوپ تھی۔ سائے لیے ہونے لگے تھے۔ سب پر داخل رہی تھی اُ رہا تھا جیسے ماحول میں پنکھاریاں ہی سلگ رہی ہوں۔ ٹیلوں پر اور بھی زیادہ پیش اور گرم سماں تھا۔ تم لوگوں کے وقت کی کوئی لڑکی ہوتی تو کبھی بھی اس ٹھنڈ اور صحن میں بیٹھو پینے جاتی مگر بھی ہمارے عادتوں کی قوت بات ہی دوسری تھی۔ نہ سردی گرمی کا احساس ہوتا تھا نہ محو و مشقت سے گھبراہٹ بلکہ ہر وقت اک سرخوشی اور طمانیت کی کیفیت رہتی تھی۔

جانے کتنا وقت گزرا ہو گا کہ مجھے احساس ہوا۔ یوں جیسے کوئی معمول سے ہر بات ہوئی ہو۔ میں چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر دُور تک جھڑپریوں اور سنسناء بیٹھوں کے جھاڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں دوبارہ بیٹھوں کی طرف متوجہ ہو لیکن دوسری آواز پہلی آواز سے زیادہ تیز اور واضح تھی۔ میں فوراً ہی جھاڑیوں۔ باہر نکل آئی اور متحس نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگی اور جلد ہی اپنی کوشش میں یاب بھی ہو گئی۔

ٹیلے کے نشیب میں بستی کی طرف سے آنے والے کچے راستے پر چلتی آ رہی تھی بھاری بھر کم جیپ آ کر رکی تھی اور اُس کا دروازہ کھلنے کی آواز ہی سنانے میں دُور گونج گئی تھی۔ میں گردن بڑھا کر نیچے دیکھنے لگی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جیپ۔ تین آدمی اترے اور لیے لیے ڈگ بھرتے ہوئے اور بغیر کوئی آواز نکالے ہو۔

لہستان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

یہ کچھ ایسی انہونی نہ تھی۔ میں دوبارہ بیٹھوں نے میں مصروف ہو گئی مگر فوراً ہی آواز آئی۔ دھیان بار بار چمکتی لٹکانے مارتی جیب کی طرف جا رہا تھا شاید میں نے اپنی زندگی میں اول بار اتنی شان دار چیز دیکھی تھی۔

دل اندر سے بے ایمان ہونے لگا۔ سوچا کیوں نہ اتنی پیاری چیز قریب سے دیکھ آواں۔ جانے پھر موقع ملے کر نہ ملے! میں نے تیزی سے بیٹھوں سے رومال سمیٹا اور جلدی جلدی ٹیلے سے اترتی دھوپ دھوپ گاڑی کے پاس جا ٹھہری جو پاس سے اور بھی زیادہ طرح دار اور بارعب لگ رہی تھی۔ میں چاروں طرف سے گھوم گھوم کر اُس کا جائزہ لینے لگی۔ کالے سیاہ بڑے بڑے پیہوں پر کھڑی یہ جیب میرے نزدیک دنیا کا نظم ترین عجوبہ تھی۔ اُس کے چمکتے ہوئے شفاف ٹیشوں کے پیچھے آرام دہ شیش اور اسٹریک صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہی۔ تھک بار کر میں پھر اُسے جھانکنے اور تاکنے میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر گزری تو مجھے پھر ہزوک اٹھی۔ بار بار جی بھل رہا تھا کہ آرام دہ نشستوں پر بیٹھ کر دیکھا جائے۔ اس ارمان کو پورا کرنے کے خیال سے میں نے پھر سے اُس کے دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ عین اُس وقت کوئی زور سے دھاڑا۔

”اُوئے! یہ کیا کرتا ہے؟“



میں نے اپنی پوری عمر میں اتنی اُجلی دُجیہ اور جامہ زیب شخصیت دیکھی نہ تھی
پہلے اپنے میلے کپیلے بابا کے علاوہ بہت کم کم لوگوں کو دیکھا تھا مگر اُس جیسا کوئی نہ
چند ٹاپے مکور ہو کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اُن کے چہرے سے لے کر آنکھوں تک بڑی ہی دلاویز مسکراہٹ بکھری ہوئی
ایوں جیسے ابھی ہنسے کہ تبھی ہنسے۔

اور مجھے ہونٹوں کی طرح دیکھتے پا کر سچ سچ ہنس پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری
ہانسنے لگی ہو۔ میری محویت ٹوٹ گئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی منہری چھڑی
اُن دفعہ ہلکے ہلکے سے میرے سر پر ماری اور دوبارہ گویا ہوئے۔ ”ہم پوچھ رہے ہیں
کہ کون ذات شریف ہیں؟“

میرے منہ سے نوٹے پھوٹے الفاظ بہ مشکل نکلے۔ ”..... من..... مر.....
..... مریاں ہوں۔“

”مریاں!“ انہوں نے زیر لب دہرایا۔ ”عجب بے ٹکا..... ہمارا مطلب ہے
اَل چپ نام ہے۔“ انہوں نے اُن دونوں آدمیوں کی طرف دیکھ کر کہا جو شاید اُن
کو نہ کرتے۔

”ہمارے خیال میں تمہارا نام بہک چاندنی، نیلم، شبنم، خوشبو یا ملائکہ وغیرہ ہوتا
ہے تھا۔“ انہوں نے کسی ایسے انجانے انداز میں کہا کہ کچھ نہ سمجھ سکے کے باوجود
ہے جی کو پچھلے لگ گئے۔

”رہتی کہاں ہو؟“ انہوں نے پھر سوال کر دیا۔

”وہ..... ادھر.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر قبرستان کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں
میرے اشارے کے تعاقب میں قبرستان کی طرف دیکھا۔ صورت پر حیرت کے
رہنمایاں ہو گئے۔ کچھ نہ سکنے کے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”اوئے! یہ کیا کرتا ہے؟“

میں اُچھل پڑی۔ ساتھ ہی بدک کر بھاگنا چاہا لیکن دو مضبوط ہاتھوں نے
طرح دیوچ لیا۔ میرے منہ سے مدھم سی چیخ نکل گئی۔

”ارے چھوڑو..... چھوڑو..... چھوڑو اسے فوراً!“ کسی نرم آواز نے مداخلت
کی۔

گرفت فوراً ڈھیلی ہو گئی۔ آزاد ہوتے ہی میں اُس سخت سخت ہاتھوں والے
غلیظہ ہو کر ڈور جا کھڑی ہوئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میں ابھی تک سید مجنوں
مانند کانپ رہی تھی۔ لرزاں اور بدحواس کھڑی تھی۔ اس جید وجد اور بھاگا دوڑی
میرا پیلو بھرا ڈومال چھوٹ گیا تھا اور اب اڑ کر کسی کے قدموں سے لپٹا پھڑ پھڑا رہا
اور پیلو یہاں سے وہاں تک موتیوں کی طرح کھرم گئے تھے۔

”کون ہوتا ہے؟“ کسی نے ملائم لہجے میں بڑی شائستگی سے دریافت کیا۔ میں
ڈرتے ڈرتے گردن سیدھی کی۔ نگاہیں اٹھائیں۔ مانو آنکھوں میں پورے چاند
چاندنی اتر آئی ہو۔

ایلا کی شان دار ترین ”ججز“ سمجھ رہی تھی تو اب کسی کا سفید کلیوں کے مہین کرتے اور ہا چا سے میں ملبوس سرپاٹنگا ہوں کے سائے تصویر بنا جا رہا تھا۔ جانے کیوں میں ان پریشان سی تھی۔

”دن پر دن گزرے مگر میں اُس من موئی صورت اور دیگر جہاد و جلال کو نہ بھول رہی۔ وہ ہستی جو بہ یک وقت بارعب اور پروقار بھی تھی اور نرم و ملائم منکسر المزاج۔“

دنوں میں جی جی جی میں سوچتی رہی۔ وہ یقیناً کسی بہت بڑے ملک کا شہزادہ ہوگا۔ راسخا بھول کر اس قبرستان کی طرف آ نکلا ہوگا! پھر خود بہ خود الجھن سی آ پڑتی۔ کیسے بھٹک گیا ہوگا اُس کے نوکر بھی تو ساتھ تھے! غرض یہ کہ میری الجھن الجھن رہتی۔

بات مختصر..... وقت گزرتا گیا۔



ان کی حیرت اپنے مقام پر بجا تھی کیوں کہ یہاں ذور تک انسانی آبادی کے آثار تھے۔ ہاں اور ان قبروں کے درمیان باؤلی ہوائیں سر بٹکتی پھر رہی تھیں۔ پہلے کہ میں کچھ بولتی ان دونوں میں سے ایک آدی نے اُن کی معلومات میں کیا۔

”جناب والا! یہ اس قبرستان کے گورکن کی بیٹی ہے۔ ہمیں چہار دیواری میں اُس کی کٹیا ہے۔“

”اوہو..... اب سمجھ میں آیا۔“ انہوں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا جیسے ہنسی روک کر کہنے لگے۔ ”اچھا ہوا تم جانتے ہو۔ ورنہ ہمیں تو یہ خدشہ پیدا ہو کہ کہیں..... کسی روح سے واسطہ نہ پڑ گیا ہو۔“ اُن کے ساتھی ہنس پڑے۔

میں ہونفتوں کی طرح سب کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

”یہ..... تمہارے پھل تو سارے کر گئے۔“ انہوں نے ازراہ ہم دردی کہا جبکہ کرو مال اٹھایا اور جھاڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے جلدی سے رومال پکڑ لیا اور مرعوب ہو کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

”اگر کہیں ملتے ہوں تو تمہیں خرید دیں یہ پھل؟“ انہوں نے ایک بار پھر فطرت سے مجبور ہو کر کہا۔

”نہیں..... نہیں.....“ میں گھبرا گئی ”وہ..... وہاں بہت ہیں یہ پیلو۔“

اور توڑ لوں گی.....“

”اچھا..... ٹھیک ہے۔“ انہوں نے الواہی انداز میں کہا اور آگے بڑھا جیب میں بیٹھ گئے جو آٹا قانا مجھ سے دُور ہوتی چلی گئی۔ بلا آخر ایک سوڑ پر نظروں او جھل ہو گئی۔

میں کافی دیر باؤلوں کی طرف کھڑی اُدھر ہی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر پہلے تک

گھوڑوں سے میری طرف دیکھتایا مسکرا دیتا تب تو جانو میرا منوں خون جل کر خاک ہو جاتا۔ جی چاہتا کچی امانٹ اٹھا کر اُس کے منہ پر دے ماروں۔ وہ تو شکر ہے کہ جوں جوں رات ہوتی وہ کہیں دفنان ہو جاتا۔ شاید رہتا کہیں دوسری جگہ تھا۔ اگلی صبح پھر آواز نہ ہوتا۔

رفتہ رفتہ محض اُسی کی وجہ سے میں نے قبرستان کے اندر گھومنا پھرنا ترک کر دیا۔ کہیں کہ وہ شاید اپنا فارغ وقت اُلی کے پیڑ تلے گزارتا تھا۔ لہذا کھانا پکانے سے امت پاکر میں گھر کے اندر ہی کچلی مٹی سے چڑیاں طوطے بتایا کرتی اور جب زیادہ لاکڑا جاتی تو سیدھی ٹیلوں پر جانچتی۔

اُس دن کے بعد وہ خوش رہا اور خوش خواجی پھر نہ دکھائی پڑا۔ رات بدل گئی تھی۔ برسات کی آمد آدھی۔ کوئی کوئی رات خوب گھٹن والی اور اس آلود ہوتی رات کی کسی گھڑی بادلوں کے پرے کے پرے اُمنڈ اُمنڈ کر آتے۔ اُمان پر روئی کے گالوں سے امانٹ گھوڑے پر بندے اور رنگ رنگ کے جانور بن کر نچنے رہتے۔ صبح ہوتے ہوئے سون سون ہواؤں کے جھوکے ان بادلوں کو کہیں لے نہیں لے آتے۔ دن کے وقت تیز دھوپ اور سورج کی چھینے والی کرنیں بدن میں اُلوں کی طرح رگڑنے لگتی۔

گرمی۔ کچھ ایسے ہی کچھ کچے دنوں میں ایک رات کل کر بارش ہو گئی۔ سویرے طرف بل فصل ہو گیا۔ صبح دم باغوں میں کوکنے والی کوئل پہلی بارش کی پیامبری ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس روز میں بہت دیر تک ہان کی چار پائی پر لیٹی رہاؤں پر کروٹیں بدلتی رہیں۔

آج کسی پہلو قرار نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا کوئی انہونی ہونے والی ہے۔ کیا؟..... یہ خبر نہ تھی! بارش تو کب کی ختم ہو چکی تھی مگر منہ اندھیرے کے نکلے بابا

بابا کے شب و روز اُسی طرح بیت رہے تھے۔ آج کل اُن کے ساتھ نوجوان گورکن بھی نظر آ رہا تھا۔ گا ہے گا ہے اُس شخص کو میں نے قبرستان کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا پھر وہ بابا کے ساتھ کثرت سے نظر آنے لگا۔ اُن کے حصے دوڑ دوڑ کر کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ہاتھ میں کبھی بابا کی کدال اور کبھی دکھائی دینے لگا اور خود بابا کبھی قبرستان کے مشرقی حصے میں کبھی کسی پیڑ کے نیچے ٹوٹی پھوٹی دیوار کے سائے میں اپنا بہاول پوری تھلے لے کر گڑا تے دکھائی دیتے۔ نوجوان تو کیا اچھی خاصی عمر کا بندہ تھا۔ تھوڑے دنوں میں اُس کا نام سننے میں آیا۔ بابا کو اُس کے آنے سے بہت آرام مل گیا تھا۔ شاید اب اُن کی عمر یہ تھا نہ تھا اس لیے انہوں نے "نما کئے" کے سامنے بڑی جلدی پر ڈال دی اور طرح سے اُس کے جیسے محتاج ہوتے چلے گئے۔ وہ اُس کی مستعدی تیز رفتاری اور "سنواری" سے بہت خوش تھے اور اکثر اُس کی تعریف کرتے رہتے لیکن مسئلہ کیوں بابا جتنے اُس سے مطمئن تھے مجھے اتنا ہی وہ برا لگتا تھا۔ وہ اکثر گھیر وار شل میلی سی کپڑے کی بندھی میں ملبوس رہتا تھا۔ بغیر آستینوں کی یہ بندھی اور اس میں جھلکتے اُس کے کالے کالے مونے مونے بازو ہر لگتے اور جب کبھی وہ مچی

ماکھے کا نام سن کر میں بل بھن گئی۔

اُس کے آنے سے پہلے پہلے تیار روٹیاں اچار اور تسی سے بھرا ہوا جگ گلاس اور ہنڈیوں کا کٹورا جو میں نے گزری شام پکائی تھیں اندر چٹائی پر رکھ آئی اور ماکھے کو کوئی ہوئی تو او بارہ چوبے پر رکھ دیا۔ اندر سے باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

کھانے کے بعد بابا نے اُس سے کہا۔ ”جاما کھے! گھر چلا جا۔ تو بتا رہا تھا تیری ماں بیمار ہے۔“

”ہاں جی۔ اُسے پچھلے چھ (بفٹے) سے بکھا رہا ہے۔“

”اُسے دوا دارو لا کر دی یا یوں ہی پڑی ہے؟“ بابا نے پوچھا۔

”ہاں جی کل حکیم جی کو دکھا دیا تھا۔“

”اچھا اب تو قافٹ گھر کی راہ ناپ ایسا نہ ہو بارش تجھے راتے میں آ لے۔“ بچم کی طرف سے بڑے زور کا بادل اٹھا ہے۔ کچے گھیارے یوں ہی کھٹے کھٹے پانی میں ڈوب گئے ہیں۔“

بابا نے بڑی فراخ دلی اور ہم دردی سے اُسے جانے کی صلاح دی۔ اس سے پہلے کہ ماکھا اندر سے برآمد ہوتا میں چھپاک سے بغلی کوٹھڑی میں جا گھسی۔ تب وہ سارے گھر کو آنکھوں آنکھوں میں ناپا جھانکتا باہر چلا گیا۔

اُس کے جاتے ہی بابا تو پڑ کر سو گئے اور میں بدتن بھاٹھ سے سمیٹ کر دھونے مانجھے بیٹھ گئی۔ صبح سے جو طبیعت میں کسل مندی اور عجیب عجیب خیالات آرہے تھے کام دھندے کی ذہن میں خود بہ خود ماند پڑ گئے تھے۔

بابا نے ماکھے سے کچھ ہی کہا تھا آن کی آن میں آسمان یہاں سے وہاں تک سیاہ گھنگھور گھٹاؤں سے اٹ گیا تھا۔ ہوا میں سنسنات آگئی تھی۔ بادل تیار تھے کوئی دم

اب تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ میں اٹھ بیٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ دروازے پر آہ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ماں رسولان ہاتھ میں سلی سی نوکری سنبھا دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کچھ آلودہ جوتے اُس نے صحن میں اتارے آگے بڑھ کر نوکری مجھے تھما دی۔ مٹی کی روٹی ہانڈی میں تازہ تازہ جند کی پھلیوں کا اچار بھرا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ بابا کا مرغوب ترین اچار تھا۔ جند کی پھلیوں کے اچار کے ساتھ وہ باجرے کی تین تین چار چار روٹیاں کھالیا کرتے تھے۔ ہمیں یہ ہر دفعہ یہی ماں رسولان بنا کر دے جایا کرتی۔ ماں رسولان بہتی میں رہنے والی تھیں وہ عورت تھی جس کے جواں سال بیٹے اور شوہر کی قبریں قبرستان کے جس گوشے تھیں بابا ادھر کی خبر گیری دل و جان سے کیا کرتے اور بدلے میں جند کی پھلیوں کا اچار پایا کرتے۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چلی گئی تو میں نے چوبے زرخ کیا۔ مجھے معلوم تھا آج بابا بہت خوش ہو کر کھانا کھائیں گے۔ میں نے جلدی باجرے کا آٹا بھگو یا اور چولہا ساگنے لگی۔ برسات کی بھڑی تکتے ہی میں بہت سارا ایندھن پچھلی کوٹھڑی میں ڈال دیا تھا لیکن پھر بھی ٹکڑیاں سلی سلی ہو تھیں، تم دار ہواؤں کے جھونکے دھواں اڑائے لیے جا رہے تھے جیسے تیسے میں آگ جلائی لی اور باجرے کی گرم گرم روٹیاں اتارنے لگی۔ آخری روٹی اتار کر تو میں ہی تھا کہ بابا کھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ باجرے کی روٹیوں پر نگاہ پڑنے اُن کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ وہ سمجھ گئے ماں رسولان آج جند کی پھلیوں کا اچار لگئی ہوگی۔ نورانی کسی خیال سے وہ واپس پلٹے اور دروازے سے گردن نکال کر با

لکائی۔

”اوئے ماکھے۔ آ جا دوڑ کے آ جا تو بھی میرے ساتھ کھالے۔ آ

ڈوڈھے (باجرے کی روٹی) اور پھلیوں کا اچار ہے۔“

میں ڈوبی ڈوبی لگ رہی تھیں۔ بادلوں بھری اس دو پہر جو گہری اسنڈلی شام کا منظر پیش کر رہی تھی پورا شہر خوشیاں کسی بے نام سنانے میں گھر لگ رہا تھا۔ اونچے تناور درختوں اور ننھی مٹی وسیع حجم والی جھاڑیوں کا پتاپتا بونا بونا حلاؤ حلاؤ تروتازہ ہو گیا تھا کہیں کہیں سدا بہار جنگلی پھولوں پر تھلیاں منڈلا رہی تھیں۔ خود رو گھنی جھاڑیوں کے گہرے سایوں میں برساتی مینڈکوں اور چھوٹی چھوٹی گھریلوں کی اچھل کود شروع ہو چکی تھی۔ مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز رہ رہ کر ابھرتی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں بھی اہلی کے پیڑ کی طرف دوڑ لگا دیتی یا پھر ٹیلوں کا چکر لگانے چل دیتی جہاں بھڑبھڑیوں پر لال لال کھٹ مٹھے ہر سیروں کے حساب سے لدے پھندے میرا انتظار کر رہے ہوں گے مگر اندر سے دل ہی میں اٹنگ نہ اٹھی۔ طبیعت بھی کبھی ہو رہی تھی۔ اندر آنے سے قبل میری نگاہوں نے بابا کو ڈھونڈنا چاہا۔ کافی فاصلے سے کدال چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہوا سے بابا کے کپڑے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میں جانتی تھی اب وہ دو تین گھنٹوں کے لیے مصروف ہو گئے۔ برساتی دنوں میں ہر سال ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ بعض بعض دن تو بابا صبح سے شام تک برسات کے پانی سے بیٹھ جانے والی قبریں ٹھیک ٹھاک کرتے رہتے جس کے بدلے میں اکثر لوگ انہیں کوئی معاوضہ دے دیا کرتے تھے۔ اب جب سے ماکھا اُن کے مددگار کے طور پر نمودار ہوا تھا صبح کے وقت آنے والی میتوں کا کام بابا کی نگرانی میں وہ کر لیا کرتا تھا۔ بابا ضرور اُسے کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہوں گے مگر میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

میں واپس اندر آ کر چار پائی پر لیٹی تو کافی دیر سوچتی رہ گئی کہ روٹی کھاؤں۔ حالاں کہ باجرے کی ایک روٹی رکھی تھی مگر جانے کیوں چاہتے ہوئے بھی کھا سکی اور نہ کھانے کو جی چاہا۔ کمرے کی فضاؤں میں بکے ہوئے آموں کی میٹھی میٹھی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک گوشے میں کافی سارے آموں کا ڈھیر لگا تھا۔ کچھ سوچ کر میں جھولی

بانا تھا کہ برس پڑے اور یہی ہوا جیسے ہی میں کام سمیٹ کر اُٹھی مونی مونی بونہ ٹپاٹپ کرنے لگیں میں نے چوٹے پر لوہے کی تغاری ڈھکی کبھی ہونی ٹکڑیاں اٹھا ا اور دوسرے پاؤں رکھ کر اندر بھاگ آئی۔ بابا ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ کچی مچھ پر بوندیں ایک کے بعد ایک تو اتارے گر رہی تھیں۔ باہر قبرستان درختوں اور جھاڑیوں میں بارش اور ہوا کے جھونکوں سے بھونچال سا مچا ہوا تھا۔ آج بارش میں ہواؤں کی تیزی غیر معمولی لگ رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچا ممکن ہے بادل اڑا لے جائے اور مینڈک جھم جائے؟

نہ معلوم کتنا وقت گزرا ہو گا کہ بارش کا زور ٹوٹنے لگا۔ بلا آخر بوندوں کی تیز رفتاری بوجھاؤ ہلکی پھلکی پھوار میں تبدیل ہو گئی اور ہوائیں میں دھیمی چال چلنے لگیں۔

میں اس وقت کسی نے باہر کے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ماکھے جانے کے بعد میں اندر سے کنڈالکا آئی تھی۔ بابا پہلی دھمک پر اٹھ بیٹھے تھے۔ جب تک دوسری آواز آئی وہ دروازے تک جا پہنچے تھے۔

گچھڑے بچتی بچاتی میں اُن کے پیچھے آئی۔ باہر ایک سے زیادہ افراد تھے اور انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تب کسی نے سرگوشی کے لہجے میں دخل دیا۔ "یار! سمجھنے کی کوشش کر بہت بیمار ہے تھی بے چاری۔ بھوت تو سویرے ہو گئی تھی مگر پانی کی وجہ سے تجھے کھیر نہ کر سکے اب میت کا ہیٹ بھول جا رہا ہے۔ یار اب کھدا کا کھوب کر۔ قنات لہ کھود۔ گرنی کا ہے کچھ اور نہ ہو جائے۔ ہم میت لے کر آتے ہیں۔"

اصل واقعہ سننے ہی بابا نے مزید جھٹ نہ کی اور کدال اٹھا کر فوراً قبرستان اندرونی حصے کا رخ کیا۔ میں وہیں دروازے پر کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی موسم کی پہلی بارش خوب کھل کے برس گئی تھی۔ کثرت اُن کی کچی قبروں کی تھی جو پانچ

کی ریم جھم آموں کے جھنڈا اُلی کے کنارے 'بیلو کی جھاڑیاں' جھڑیوں کے کھٹ
مٹھے پیر لمحوں میں بے معنی ہو کر رہ گئے۔

میرے بابا 'باجرے' کی روٹی اور جٹ کی پھلیوں کا اچار کھا کر۔۔۔ آخری بار کھا
کر۔۔۔ اگلے جہان جا بسے۔۔۔ اور میں اس بھری پری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ اتنی تنہا کہ
جس کا قسم کھانے کو بھی کوئی نہ باقی رہا تھا۔

گھر میں کون آیا کون گیا۔ بابا کی آخری تیاریاں کس طرح ہوئیں۔ کس نے
کی۔۔۔ سب کی لہریں کھودنے والے کی اپنی لہر کس نے کھودی۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔
ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹی تو ہستی کی چند عورتیں میرے ارد گرد گھیرا باندھے بیٹھی تھیں
اور ایک موٹی سی کالی عورت میرا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھی تھی۔

ایسے میں جب کہ میرا جی پاؤں رہا تھا کہ اپنا آپ پیٹ پیٹ کر روؤں وہ عورت
عجیب عجیب ہچکچاتے حرکتیں کر رہی تھی کبھی دودھ کا پیالہ میرے منہ سے لگاتی۔ کبھی آم
کھانے کا اسرار کرنے لگتی اور تو اور روٹیوں پر بکھن چڑ کر لے آئی کہ "میں یہ خاص طور
پر تیرے لیے پکا کر لائی ہوں۔"

حالاں کہ وہ میری بھلائی کی خاطر سب کچھ کر رہی تھی مگر پتا نہیں کیوں مجھے اس
کے اندر سے چاٹ پڑی اور فریب کی بو آ رہی تھی۔ مجھے میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی
تھی۔ "یہ بہ ظاہر کچھ اور اندر سے کچھ ہے مگر یہ ہے کون؟" جلد ہی یہ عہد بھی کھل گیا۔
وہ ماکھے کی اماں تھی۔ خود ماکھے کو بھی میں نے بڑی مصروفیت اور سرگرمی کے عالم میں
اندر باہر آتے جاتے دیکھا۔

کسی سمجھ نہ آنے والے اسرار کا خدشہ مجھے سہا گیا اور میں رونا بھول گئی۔ میرے
بچے کو بے قرار آسوخک ہو گئے۔

آج میرے بابا کے قتل تھے۔ لیکن سنے۔۔۔ نئے اندیشوں کے زہر پلے ناگ

میں چند چوسنے والے آم اٹھا لائی اور کمرے کی دلیز پر آ بیٹھی۔ تبھی قبرستان۔
چانگ کی طرف سے بہت سارے پیروں کی مخصوص چابچیں ابھرنے لگیں۔ اس۔
ساتھ ہی کلمہ شہادت کی پکار سنائی دی۔

مجھے پتا چل گیا کہ لوگ نئی میت کو کاندھے دیتے ہوئے احاطے کے اندر آ رہے
تھے۔ تاہم میرے لیے یہ تقریباً ہر روز کا معمول تھا۔ آنکھ اسی ماحول اور اسی دنیا
شب و روز میں کھولی تھی اس لیے چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی آم چوستی رہی۔
اچانک ہوا کے دوش پر ایک دل خراش چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ ایسی چیخ
باقی تمام آوازوں پر حاوی تھی۔

اس بھرا آم میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ میں اٹھ کر اندھاؤند یاہر
جانب بھاگی۔ یہ آواز میں سیکڑوں آوازوں میں علیحدہ سے شناخت کر لینے
صلاحیت رکھتی تھی اور خوب پہچانتی تھی کہ چیخ کہ یہ آواز میرے بابا کے سوا کسی کی نہ
ہو سکتی!

میں سر پٹ کچڑ پتھر پانی اور قبریں الٹاتی چلا گئی، اسی طرف بھاگتی چلی جا رہی تھی
'جدھر بابا کو کدال چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔

مگر اب وہاں مجھ سے پہلے دسیوں آدمی پہنچ چکے تھے۔ ان سب نے میرے
کو ہاتھوں ہاتھ سنبھال رکھا تھا۔ لیکن وہ آنا فانا سننے کے رتبے کی حد پار کر چکے تھے۔ ا
سے چند قدم دور تقریباً ڈیڑھ ہاتھ لمبا کالا سیاہ سانپ پڑا تھا جس کا لوگوں نے لاشیا
اور پتھر مار مار کچھو نکال ڈالا تھا۔ بابا کا وہ ہاتھ جس پر اس نے ڈسا تھا کندھے کا
نوج کر لیا ہو چکا تھا۔ ان کی رنگت گہری نیلی نیلی نظر آ رہی تھی۔

پل کے پل میں قیم ہو گئی۔
میرا گھر بھری برسات میں جل گیا اور میں زندہ درگور ہو گئی۔ کوئل کی کوکونہ

میں وحشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اچانک حیرت سے میرا منہ کھلے
کا کھلا رہ گیا۔

میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی کہ اس شان دار جیب والے اجنبی کو کبھی
دوبارہ دیکھ سکوں گی! اور وہ بھی خود اپنے جھوپڑے میں! میرے رہے کے حواس بھی
ہاتے رہے۔ لیکن یہ اصل حقیقت تھی کہ وہ باوقار بارعب شخصیت جن کے قدموں میں
ایک جلتی دوپہر میں میرے تمام جیلو پنجاور ہو گئے تھے میرے سامنے کھڑے تھے۔
ان کے ساتھ تین چار مرد اور بھی تھے۔ آج بھی وہ سفید براق لباس پہنے تھے مگر چہرے
پر اس وقت مسکراہٹ کے بجائے گہری سنجیدگی اور تنہائی کی چھاپ تھی۔ ان کی
آنکھوں میں جیسے دیے جل رہے تھے اور نگاہیں میرے میلے کچیلے چہرے پر گڑی تھیں۔
میں نے ان کے ہونٹ ضرور ہلکے دیکھے مگر سنائی کچھ نہ دیا۔ چہرے کے دل گداز
تاثرات اور نرم و ملائم انداز نے سمجھایا کہ وہ ضرور ہم دردی کے بول بول رہے ہوں
گے۔ کچی ہم دردی اور غم گساری جو خود بہ خود دل میں جگہ بناتی ہے۔

میں سر سے پاؤں تک سراپا آنسو بن گئی۔

دل کی گہرائیوں سے ایک ٹوک اٹھی۔ میں اپنے آپ میں نہ رہی اور وڑ کر ان
کے قدموں میں بکھر گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ من جو کچے پھوڑے کی طرح
زکھ رہا تھا۔ پھوٹ بہا۔ میرے ساتھ ساتھ بستی کی ہر عورت رو رہی تھی۔ لگتا تھا آج
انکھوں کے سیلاب میں میری بستی بہہ جائے گی۔ میری بے قراری اور آواز دوزاری سے
شاید گھبرا کر وہ جلدی سے میرے قریب زمین پر بیٹھ رہے۔

اور پھر دیکھنے والی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ انہوں نے کسی کی پردہ
لیے بغیر اپنے گرم ہاتھوں کے کٹورے میں میرا چہرہ تھام لیا اور بہت پرسوز لہجے میں
کہنے لگے۔

میرے آس پاس پھنکار رہے تھے اور میں کھل کر رونہ لگی۔ بستی کی عورتیں بتا رہی تھیں۔
”میرے بابا کے صندوق سے بہت کچھ ملا۔ بہت سے چاندی کے گہنے بھی اور
نقد روپیہ بھی۔ اس کے کفن و فن اور دیگر اخراجات کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ
پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔ سب کام بہت خوبی سے اُسی کی محنت کی مدد سے لگائی گئی
انجام کو پہنچے۔“

لیکن مجھے اپنا انجام بہت مشکوک نظر آ رہا تھا۔ معایاد آیا تاکھے نے بابا کو اپنی ماں
کے متعلق یہی تو کہا تھا۔ ”اُسے ایک ہتھے سے بکھا آ رہا ہے۔“ مگر مجھے تو وہ بستی کئی
عورت کسی طرف سے بتا رہی تھیں۔ اس بچے جھوٹ نے مجھے حریف متفر کر دیا۔

شام سے پہلے بستی کی کچھ عورتیں حریف آئیں اور گھر آگن بھرا بھرا سا کتنے لگا
لیکن اصل میں میرے بابا کے بغیر یہ گھر خالی ہو چکا تھا۔ عورتیں اُلی اور بھجور کی گھلیوں
پر کھڑے شریف بابا کے ایصال ثواب کے لیے پڑھ رہی تھیں اور میں کونے میں سر نہوڑے
بیٹھی تھی۔ دل زندگی اور زندگی کے تمام لوازمات سمیت ہر طرح کے عذاب ثواب
سے منکر سا ہو رہا تھا۔ جوں جوں برسات کی کالی اندھیاری رات سر پر آ رہی تھی میرا
ہولوں سے نہ ا حال تھا۔ مجھے معلوم تھا شام گہری پڑتے پڑتے بستی کی یہ ہم درد اور
سادہ دل عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں گی اور پھر..... آگے ماکھے اور اس کی
ماں کی صورتیں ڈراؤنے بھوتوں کی مانند آنکھوں کے سامنے گھٹن ہونے لگیں۔ ان
دونوں کے انداز بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ دل ہی دل میں مجھے یقین کامل تھا کہ
انہوں نے اب یہیں مستقل ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ مشکل ہے جواب یہ یہاں سے
نکلے۔

”یا مولا! میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟“ اپنے اس سوال سے میری زورج یلجلا
اٹھی۔ ”بابا! آپ مجھے اکیلی چھوڑ کر منوں مٹی تلے کیوں جاسوئے؟“

لا پھر ماں آپ ہی آپ اونچی آواز میں بولنے لگی۔

”خدا نہ کرے مریاں دنیا میں اکیلی رہ جائے۔ ہم کیا مر گئے ہیں اُس کے بے۔ جاتے دھت بابا خوشیے نے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا تھا۔ ”میری بابا خدا کے بعد تیرے حوالے۔“

میں ہکا بکا رہ گئی۔ ہر کوئی حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ لیکن وہ بڑی ڈھٹائی اور اطمینان سے اپنی بات پر بہ خند تھی۔ ماکھا بڑھ بڑھ کر اُس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ میرے اندر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ”یہ عورت کوئی چال چل رہی ہے۔“ کچھ دیر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ انہوں نے سب کو خاموش کر لیا پھر براہ راست مجھ سے پوچھا۔

”تم... کیا کہتی ہو اس بارے میں؟“

”مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“ میں رونے لگی۔ ”نہ ہی میرے بابا نے مجھے کبھی کچھ بتایا۔ اس عورت کو تو میں نے آج ہی پہلی بار دیکھا ہے۔ اس کا بیٹا چند بیٹوں سے بابا کے پاس کام کرنے آنا شروع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی۔“

میرے اس بیان کی تصدیق بہت سی کئی مرد و زن نے کر دی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ماکھے اور اُس کی ماں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس بے پر کی اُڑانے پر انہیں جان بچانی مشکل ہو گئی۔ حالات یکا یک بدلنا کھائے تھے۔ میں اگر بروقت نہ کھول کر جی نہ کہتی تو یقیناً ماکھے اور اُس کی ماں کے رحم و کرم تلے دبی و بانی پڑی رہ جاتی۔ لیکن اب بہت سی کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بابا خوشیے کی بیٹی کے کس طور کام آئیں کہ اُس کی پکڑ کی پہلی نگاہ نہ پڑے اور اس کا مستقبل بھی سنور جائے جو واقعی اب بے آسرا تھی۔ اور پھر... قدرت نے نرالا کھیل کھیلایا۔ آسمان نے وہ نظارہ دیکھا جو

”لہ! ان آنسوؤں کو روک لو۔ ہم نے آج تک کسی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ آنسو ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ بس یہ بتاؤ کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں تم کیا چاہتی ہو؟“

مجھے بے اختیار وہ پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ جب میرے پیلو گھر سے دیکھ کر انہما نے اسی ہم دروی سے پوچھا تھا۔ ”بھل... اگر کہیں ملے ہوں تو خرید کر دے دیں اور اُس دن میں نے جلدی سے انکار کر دیا تھا مگر دونوں ملاقاتوں میں زمین آسمان فرق حائل تھا۔

اُس دن میں باپ کے سائے تلے بے فکر و بے خبر اور ہر سو بچ سے آزاد ہر نئی مانند چوڑیاں بھرتی بھرتی تھی اور آج مستقبل کے اندیشوں میں گھری ہوئی جیم لڑ تھی۔ ہاں! آج میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

مگر زبان سے پھوٹی بھی کیا!

ایک کے بعد ایک آنسو ٹوٹی مالا کی طرح رخساروں پر بہا کیے اور میں مگر مگر ان صورت نکلا کی۔ تب وہ بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور سب عورتوں سے مخاطب ہوئے۔

”آپ لوگوں میں کوئی بھی اس کی چچی، نانی، خالہ، ممانی، پھوپھی یا کوئی دوسرا رشتہ دار موجود ہے؟“

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ سچ ہے میرا کون سا عزیز موجود تھا جو کوئی بولتا۔ اب حیران ہوئے۔

بے قیمتی کے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا واقعی یہ دنیا میں یکہ و تہا رہ گئی ہے۔“ کسی نے ان کے سوال کا جواب نہ دیا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے۔ انہی لمحات میں ماکھے اور اُس کی ماں نے آنکھوں میں آنکھوں میں کوئی صلا

جیسے انہوں نے اپنے اصل علاقے اور خاندان سے کوسوں دور بڑے خفیہ طور سے لیا۔ یوں مجھے اور شادو کو کوئی تنگی تکلیف نہ تھی۔ رہائشی مکان میرے نام تھا۔ بات کھلے ہاتھ سے دیتے۔ کوئی ملازم وغیرہ میں نے اپنی مرضی سے کبھی نہ رکھا۔ اماں بیٹی کا کام ہی کتنا ہوتا! شادی کے بعد تو کبھی کبھار ہی آتے رہے۔ میری بہت سے زیادہ ملا تھا اس لیے میں نے کبھی ناشکری نہیں کی۔ مجھے میری اوقات ہر ماں یاد رہی۔ میں نے اُن سے کبھی ایسی سیدھی فرمائش یا مطالبہ نہ کیا۔ انہوں نے مجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اپنی زندگی میں ”مریاں“ کے بجائے اسی ”کہہ کر پکارا۔

میرا اُن کا ساتھ ہی کتنا رہا؟ بس چند سال اور پھر دوبارہ ”مریاں“ بن گئی اور اُن ”شاد جہاں بیگم“ شادو ہو گئی۔ بیٹا! جس شریف انسان نے مجھے اپنے نام ”منسوب“ کیا تھا میں بھلا بعد اُن کے انتقال کے اُن کے نام کو دھبا لگاتی؟ نہ بیٹا نہ اہسان فراموش ہر گز نہیں۔ جب وہ ہی نہ رہے جو دراصل ہمارا سائبان تھے تو پھر کس سے کرنے جاتی۔ اگر ہماری قسمتوں میں روزِ اوّل سے خواری اور سیاہ بختی نہ لگ جاتی تو ان کی زندگی وقار نہ کر جاتی! مجھے تو دنوں اُن کی موت کی خبر نہ ہوئی۔ بہت میں معلوم ہوا کہ بالکل اچانک ہی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ کسی سے کچھ کہہ سنا بھی آئے لیکن ہمارے نکاح کی پتا نہیں کیسے ان کے بہنوئی کو سن گئی! بس بقیدِ قصہ انہی کے ہاتھوں ہوا۔ ظاہر ہے ان کو بہت اندیشے ہو سکتے تھے مجھ سے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی راتوں رات شادو اور میں اپنی جان بچا کر نکل آئی۔ کچھ عرصہ راستی میں بھی رہی لیکن پیٹ تو اپنا اندھن مانگتا ہے! پھرتی پھرتی ان بیگم صاحبہ آ نکرائی۔ اللہ ان کو تنگی دے۔ اب تو سوچ لیا ہے عمر کا باقی حصہ بیٹھی پڑے گزاردوں گی۔ ”وہ ایک لمبا سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔ آنکھوں سے سادون

بہت کم کم دیکھا ہوگا۔ ادھر عصر کے بعد بابا کے سوئم کی فاتحہ ہوئی اور ادھر مغرب ساتھ ہی میرا نکاح ہو گیا۔ اُسی جیپ والے اچھی سے۔ پل بھر میں میں کچھ سے کچھ گئی۔ مجھے میری حیثیت اور میری بساط سے بڑھ کر مل گیا تھا۔ بستی والے خوش بھی حیران بھی۔

سب نے مجھے اپنے ہاتھوں اُسی شان دار جیپ میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔ دھولک بچے نہ اُٹھن لگا نہ مہندی لگی نہ سکھیوں نے دوائی کے گیت گائے اور نہ ہی ہاں شادی ہو گئی۔

کسی نے ٹریک ٹول کر دھلا ہوا ایک جوڑا نکال کر پہننے کو دیا تھا وہی پہنا رخصت ہو گئی۔ شبہات یاں کا ہے کی بکتیں؟ نہ کوئی بھیّا تھا نہ میانہ باپ۔ ہاں بستی والا نیک دل لوگوں کی سسکڑوں دھائیں ساتھ تھیں۔

کیسا سماں تھا وہ بیٹا! میرے پاس الفاظ نہیں کہ بیان کر سکوں۔ کبھی خواب! بھی ایسی صورت حال کا گمان نہ گزرا تھا۔ وہ قبرستان جہاں بہن بھائی اور ماں باپ ابدی نیند سوئے ہوئے تھے وہ بستی وہ ماحول وہ ہوائیں وہ فضا تھیں حسرت۔ آخری بار دیکھتے ہوئے چھوڑ دیں۔

آگے کی زندگی ہوا کا ایک خوشبو بھرا جھونکا بن کر گزرنے لگی۔ تم لوگ یہ حقیقت جان کر شاید یقین نہ کرو کہ وہ اپنے علاقے کے نواب تھے۔ صرف ہم دروی اور۔ تھا شاہجہاں بہن سے مظلوم ہو کر مجھ سے نکاح کر بیٹھے تھے ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ ایک گھرانے میں یہ ظاہر اس وقت کنوارے ہی تھے جب کہ میں اُن کی بیوی بن چکی تھی میری بیٹی جو میری اور ان کی پہلی بیٹی تھی اور جس کا نام انہوں نے خود بہ صد شوق ”بیگم جہاں بیگم“ رکھا تھا شاید دو سال کی تھی جب ان کی شادی اُن کے اپنے خاندان سے ان کی نوابی شان کے ساتھ ہوئی۔ مجھے یہ معلومات خود انہی کی زبان ملی کرتی تھی کچھ

بھادوں کی جھڑی لگی تھی۔ جسے وہ دوپٹے کے پلو سے خشک کرنے لگیں۔

علی اور رانی چونک کر حال کی دنیا میں آ گئے۔ جیسے ظلم ٹوٹ گیا ہو۔ رانی دونوں ہاتھ بے جان سے ہو کر اُس کی گود میں پڑے تھے اور کتاب چھوٹ کر بہم جا گری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ماسی مریاں کے ساتھ اُن کے ماضی کو بچے کھوم آئی ہو۔ باوجود کوشش کے اُس کے منہ کے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اُسے پیاس کا احساس ہوا اُس نے جھک کر کتاب سبزے سے اٹھائی اور اُنھ کو گھر چلی گئی۔

ماسی مریاں کی داستانِ حیات سے علی بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اتنی دن کا کچھ احساس ہی نہ ہوا تھا۔ دوپہر کا سماں گہری پڑتی شام میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ رانی واپس آتی، علی نے ماسی مریاں کی طرف جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ”آپ نے اُن نواب صاحب کا نام نہیں بتایا۔“

”نواب ذوالفقار علی خاں۔“ ماسی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”ایس؟“ علی پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں لگے۔



رمضو اماں بی سے ہدایات لے کر بازار سودا سلف لانے کے لیے نکلا ہی تھا کہ ن پر ہارن کی تیز آواز گونجی اس کے ساتھ ہی شرمین بری طرح بھاگتی ہوئی باپتی آتی اندر داخل ہوئی اور اماں بی کا شانہ ہلا کر بے صبری سے بولی۔ ”اماں بی.....“

”ابی! ابو آئے ہیں ابو!.....“ میں نے ابھی ابھی انہیں گاڑی سے اترتے دیکھا..... وہ دیکھئے وہ ادھر ہی آرہے ہیں..... وہ اندر آرہے ہیں.....“

جلت میں یہ ساری کنسٹریکشن کر کے خود بیڈ پر رانی سے چپک کر بیٹھ رہی۔ گوکہ ابو کے ایکسیڈنٹ کے بعد دو بار آچکے تھے اور اُن کا اس وقت بھی آنا کچھ ایسا حیرت انگیز بھی نہ تھا اس لیے رانی کو اُس کے بچنے پر ہنسی آ گئی۔ جانتی تھی اس کا مقصد۔ اماں بی کو باخبر کرنا ہے۔ اور یہی ہوا۔ اماں بی دو ہٹا درست کرتی ہوئی جلدی کی کمرے سے نکل گئیں۔ فوڈ بہت سارے فروٹ اور دیگر اشیا کے پیکنوں سے بھرے پھندے اندر داخل ہوئے تو دونوں بہنوں نے آداب کیا۔ رانی نے محسوس کیا کچھ فکر مند اور سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اماں بی نے ٹرائی بھر کر بہت سے نے پینے کے لوازمات بھیج دیے تھے۔ وہ سیب لیتے ہوئے بہ ظاہر باتیں کر رہے تھے۔

انہوں نے اُس کے پسینے سے تر چہرے سے نظر ہٹا کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔
 "بیٹے! آپ کو معلوم ہے آج کل انسان کی اوسط عمر کیا ہے؟ تو کیوں نہ ہم زندگی کے
 مختصر سے وقفے کو اس کے حقیقی لطف سے محفوظ ہوتے ہوئے گزاریں؟ مرنے کے
 لمحہ کوئی واپس اس دنیا میں آتا ہے؟ تو پھر ہمیں اس چند روزہ زندگی کو بے کار قسم کی
 فتنوں اور اندیشوں کی نذر کرنے کے بجائے بھرپور انجوائے کرنا چاہیے اور میرے
 ایک زندگی کا سچا حزمہ وہی لوگ لے سکتے ہیں جو مال و دولت کی نعمت سے مالا مال
 ہوتے ہیں۔ پھر اس دنیا کی عظیم طاقت اور سب سے بڑا موثر ہتھیار ہے۔ بیٹے! پھر
 آرام و سکون اور انسانی خواہشات کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے تو اس کو ٹھوکر
 مارنے والے خوش نصیب نہیں کہلا سکتے۔ میں تو ایسے ہی خیالات کا مالک ہوں چنانچہ
 ایسے ہی اوصاف کے مالک مضبوط کریکٹر اور اعلیٰ انٹینس کے مالک ایک شخص کا
 نقاب آپ کے لیے کیا ہے جو ہر لحاظ سے آپ کے لیے انتہائی موزوں اور مناسب
 ہے۔ میرا بہترین دوست ہے زیر علی۔ اپنے وسیع اور ذاتی کاروبار کا مالک ہے۔ آپ
 تصویر دیکھ سکتی ہیں۔ شام چھ بجے میں فون پر آپ کا جواب پوچھوں گا۔"
 انہوں نے پرس سے ایک کارڈ سائز تصویر نکال کر میز پر رکھی اور ابھر اُدھر دیکھے
 لہر چلے گئے۔

وقت ڈک ڈک کر گزرا۔

زندگی کے جس موڑ کا اُس نے ابھی تک تصور بھی نہیں کیا تھا اُسے ایک فیصلہ کن
 مرحلے سے گزار کر ایک حقیقت بنا کر اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا تھا۔

یہ لمحہ اور یہ فیصلہ اُس کے لیے گزشتہ تمام فیصلوں سے زیادہ کڑا مشکل اور صبر
 آزما تھا۔ اُس پر ابو کے خیالات اور فلسفہ حیات غصہ جھلایا اور دکھ بیک وقت اُس
 کے دماغ پر ٹھوکریں رسید کرنے لگتے۔ صبح سے اب تک اُس نے ایک بار بھی زیر علی

شرمین کا ہنس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر ان کی گود میں سما جاتی عمر ورنجی
 ڈار سے صرف پر شوق نظروں سے انہیں دیکھے جا رہی تھی بے انتہا محبت اور
 سے۔

کافی دیر کے بعد ابو نے ایک طویل سانس لی پھر چائے کا کپ رکھے
 رانی کی طرف دیکھ کر کہے گئے۔

"بیٹے! آج میں آپ کے پاس بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ زندگی
 سے زیادہ اہم ترین دن۔ آپ ماشاء اللہ بہت کچھ دار اور سلجھے ہوئے خیالات
 ہیں اور جن کڑے حالات میں آپ نے وقت گزارا میری نگاہوں سے پوش
 رہے۔ میں نے ہر آن دونوں کو دل کے قریب پایا ہے آخر میری اولاد
 دونوں۔ مگر میں آج اعتراف کرتا ہوں کہ میں صحیح معنوں میں اپنا فرض ادا نہ کر
 کچھ آپ کی حد سے بڑھی ہوئی ضد اور ہٹ دھرمی بھی میری راہ اور ہر سو
 درمیان مائل رہی ہے۔ مگر اب مجھے پورا یقین ہے کہ جو میں کروں گا اور کہوں
 اُسی پر عمل کریں گی۔ نیک اور اچھی بچیوں کی طرح۔ دیکھیے بیٹی! انہوں۔
 ادھوری چھوڑ کر سگار سلگایا پھر ایک کش لے کر دوبارہ بولے۔ "بیٹیاں بڑے
 شاہوں کی بھی سدا بٹھنی نہیں رہتیں۔ والدین کا گھر بیٹی کا عارضی ٹھکانا ہوتا
 بالآخر ایک نہ ایک دن اُسے اپنی اصلی پناہ گاہ میں جانا ہوتا ہے۔ جب تک آپ
 تھیں میں نے آپ کی ہر جاوے جا ضد کو تسلیم کیا مگر اب ایسا ممکن نہیں ہے۔
 خیال میں اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ میں آپ کے مستقبل کا فیصلہ کر ڈالوں
 کو باعزت طریقے سے رخصت کر دوں چٹاں چہ میں چاہتا ہوں کہ ایک
 حیثیت سے میرے انتخاب پر پورا بھروسہ کریں۔

رانی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

کی تصویر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ابو نے انگلیوں میں جو اس کی تصویر اور نقشہ تھارانی کے لیے دودھی کافی تھا۔

سوچتے سوچتے دل و دماغ ویران مرگھٹ بن گئے۔

شام کے وقت اس میں اتنی ہمت بھی نہ رہ گئی کہ وہ ابو کا نمبر ملا سکتی۔ چھ بیچ بعد ابو نے خود ہی رنگ کیا۔

”مجھے۔۔۔ وہ پروپوزل قطعی نامنکور ہے۔“ سارا دن مختلف زاویوں سے مہوئی بات اس نے ایک ہی جملے میں کہہ ڈالی اور کہہ کر اپنی جرات اور حوصلے پر چر رہی تھی۔

”رانی! یہ کیا بک رہی ہے۔“ ابو نے زندگی میں پہلی بار اسے نام لے کر ڈھنسنے سے اُن کی آواز پھٹ گئی اور وہ ریور میں کھانسنے لگے۔ فقط ایک ہی بات رانی خاموش ہو گئی تھی جیسے قوت کو پائی سلب ہو گئی ہو۔

”بکو۔ کیا بک رہی تھیں تم؟“ ابو کو شدید غصہ تھا۔

اُن کے بار بار ”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔“ کہنے پر اس نے اپنے منتشر حواس بہ یک جا کیے اور کبھی کبھی آواز میں بولی۔ ”ابو۔۔۔ مجھے آپ ڈانٹ ڈانٹ کر نہ روک سکیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ میں سچی بات نہ کہہ سکوں۔۔۔ ابو! دراصل میں نہیں چاہتی کہ تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرائے۔ میری بے باکی کو معاف فرمائیے گا آپ کی اور لی کی بے جوڑ زندگی ہمارا سارا کیریئر اعتماد اور اطمینان چھین لے گئی ہے۔ کیا ہمارا ایک ٹارگٹ گھراٹا نہ ہوتا اگر آپ دونوں میں خیالات ملتے اور سوچوں کا تضاد حاکم ہوتا! آپ نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا ہے اسے سامنے بیان کیا وہ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے والدین کے نقش قدم پر ہرگز نہ چلوں تاکہ کئی نئی مثالیں قائم نہ ہوں۔ یہ سب آپ ہی نے مجھے دیا ہے ابو! میں سمجھتی ہوں وہ فریقین کے خیالات کا اخت

ہماری انسانی زندگی پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا ہے اور زندگی کو ایک مسلسل و مستقل کتاب میں جتلا رکھتا ہے۔ جہاں آپس کی انڈر اسٹینڈنگ مفقود ہو وہاں دل و دماغ ٹارگٹ رہ سکتے ہیں بھلا! اور پھر سب آپ کی طرح اپنی اعصاب کے مانگ تو نہیں ہو سکتے! استم تو یہ ہے کہ جہاں زندگی کسی پراپٹر کا کار ہو جائے وہاں گھاس کا سودا بھی اورت کا مقدر بنتا ہے۔ مرد صاف بری ہو جاتا ہے جس طرح آپ اور اماں بی!۔۔۔۔۔“

”اوٹ آپ۔۔۔۔۔“ وہ پوری قوت سے دھاڑے۔ ”تمہیں یہ سب غلط خیالات ہماری ماں کی طرف سے ملے ہیں۔ تم دونوں پاگل اور جاہل ہو۔ یاد رکھو۔ یہ زندگی کا بہترین چانس گنوار کر تم ہمیشہ اپنی ماں کی طرح بچتاؤ گی۔“

”جی نہیں ابو! ایسا اللہ ہرگز نہیں ہوگا۔“ رانی نے بڑے مبرجمل سے جواب دیا۔ ”آپ انسانی زندگی کو دولت کے ترازو اور قوتی ہم آہنگی کو سونے چاندی کی جھٹکار میں تول رہے ہیں۔ سوداگر تو ہم بھی ہیں مگر۔۔۔ خلوص نیک نیتی قناعت صبر اور صاف سحرے سادہ پاکیزہ خیالات کی ہم آہنگی کے۔“ اتنا کہہ کر رانی نے فون کریڈل پر رکھ کر ایک طویل سانس لی اور تھکے ماندے مسافر کی طرح وہیں کرسی پر اُجھڑ ہو گئی۔

”ہیلو! سنا ہے آپ کا جشن شادی خانہ آبادی منعقد ہونے والا ہے؟“ علی نے اچانک نمودار ہو کر اسے مزید آپ سیٹ کر دیا۔

جانے کیوں آج وہ ”تم“ سے ”آپ“ پر آ گئے تھے جیسے پہلی بار ملے ہوں یا اس سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ اس نے اُلجھ کر پوچھا۔

”ہماری خاص ہی آئی ڈی نے۔“ انہوں نے شرمین کی طرف اشارہ کیا۔ رانی نے جواب دیے بغیر شرمین کو گھور کر دیکھا وہ زور زور سے قہقہے لگاتی اور دھپ دھپ

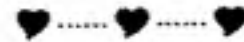
بیر مارتی 'باہر بھاگ گئی۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ علی نے پرسکون انداز میں دریافت کیا۔

”آپ سے مطلب؟“ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

وہ متحیر ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ لیکن ناراضی کے باوجود خاصی دیر وہیں ٹہل ٹہل

سگریٹ پھونکتے رہے پھر سوچ میں ڈوبے باہر نکل گئے۔



رات اُس نے سوتی جاگتی کیفیت میں بڑے کرب اور تکلیف میں گزاری اور صبح ہوتے ہوتے تیز بخار نے آلیا۔

ایک تو دیسے ہی زبردست اور جان لیوا حادثے سے معجزاتی طور پر بچ نکلی تھی اور اب بیٹھے بٹھائے نئی افتاد آن پڑی تھی۔ پے در پے ڈنکی خلقشار اور اذیت ناک سوچوں نے اُسے دوبارہ بیمار کر ڈالا تھا۔

اماں بی کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ ماسی مریاں اور وہ دوڑ دوڑ کر اُس کی تنہا رزاری کر رہی تھیں۔ دعا اور دوا دونوں جاری تھیں۔ آج کل علی نے بھی آنا ترک کر رکھا تھا۔ ابو ویسے ہی شاید ہمیشہ کے لیے ناراض ہو چکے تھے۔ بدحواسی اور ہول میں یہ دونوں بڑی بوڑھیاں ادھ موٹی ہو گئیں۔ اماں بی کو اس مصیبت اور لاچارگی کے عالم میں اکیلے اور بے بس ہونے کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ شاید لوگ ایسے کڑے وقت کے لیے اچھے شوہروں کی دعائیں مانگا کرتے ہیں ورنہ اولاد کے دکھ سکھ تنہا جھیل جانا ایک کم زور اور ناتواں عورت کے لیے کتنی پریشان کن صورت حال کو جنم دیتے ہیں یہ کوئی اماں بی کے دل سے پوچھتا! وہ تو کہو ماسی مریاں کے وجود سے پھر بھی جی کو

سے اماں بی نے اسے اٹھی میٹھ دے دیا تھا کہ "بس اب پیدل چلو۔ گاڑی کو ہاتھ بھی لگانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" رانی ذاتی طور پر بھی فی الحال اپنے میں اتنی جرأت محسوس نہیں کر رہی تھی کہ ڈرائیونگ کر سکتی۔ اس لیے صاحب زادی افروز جہاں کونوں پر کھدیا تھا اور اس نے 9 مارچ کو گاڑی بیچنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

"جشن بہاراں" میں شرکت کے لیے وہ شام کو تیار ہونے کی غرض سے ڈرائیونگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنا سراپا دیکھ کر جھک سی گئی۔ ہلکے بیگ آپ سے تو آج کام چل جانے کا ایک فی صد بھی امکان نہ تھا۔ چہرے پر چھائی بے تحاشا زردی اور آنکھوں کے حلقے اُسے پریشان کر گئے۔

بیمار تو ہر کوئی ہو جاتا ہے۔ ایکسڈنٹ بھی ہو سکتا ہے مگر اُس کی طرح ویران اور آہناڑ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی حالت خوب سمجھ رہی تھی اور جانتی تھی کہ وہ اس حد تک ڈاؤن نہ ہوتی اگر ابو سے "زیر علی" کی دہ سے رجسٹر نہ ہوتی ہوتی۔ ساتھ ہی نگاہوں میں علی اور صاحب زادی افروز جہاں کی صورتیں بھی گھوم گئیں۔ دل میں اک انہوائی سی غلطی کے ساتھ اس نے سوچا۔ "شادی کے تذکرے کے بعد علی نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔" ایک گہری سانس لے کر اُس نے پے در پے چلے آنے والے خیالات کو جھٹکا اور اپنی طرف متوجہ ہو گئی۔

"جشن بہاراں" کی نسبت سے اس نے زرد اور عنبائی پھولوں کی انتہائی نفیس ساڑی پہنی۔ بال سیٹ کر بڑے سلیقے اور صفائی سے چہرے کی پیلاہٹ اور آنکھوں کے حلقے چھپائے۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا اور کانوں میں اسی سیٹ کے آویز سے ڈال کر اُس نے آئینے پر نظر ڈالی تو خود ہی ہکا بکار ہو گئی۔



ڈھارس بندھی رہتی۔ ورنہ وہ غمناک حال ہو چکی تھیں۔

چند دن کی مسلسل جگہ کے بعد خدا خدا کر کے اُس کا بخار ٹوٹا ان تینوں نے سکھ کا سانس لیا۔

اس دوران شرمین کی شرارتیں بھی دم سدا رہیں۔ جس دن صاحب زادی افروز جہاں یا شاہ جہاں کا قون آ جاتا اُس کی بن آتی۔ کتنی ہی ویران سے کپ شپ میں مصروف رہتی۔ وہ دونوں رانی کو جلد از جلد صحت یاب ہونے کی تلقین کرتیں۔ انہی کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ 9 مارچ کو نواب فیملی کی طرف سے جب معمول "قصر دیدار" کے "گوشہ دارم" میں "جشن بہاراں" منایا جا رہا تھا۔ جس میں کالج کی طالبات بھی مختلف اقسام کے رنگارنگ پھولوں کے اشال سجانے والی تھیں۔ یہ ایک انتہائی خوب صورت اور دل چسپ پھولوں کی تقریب ہوا کرتی تھی جو ہر سال موسم بہار کے آغاز میں منعقد ہوتی۔ اس تقریب میں کالج اسٹاف کے علاوہ "قصر دیدار" کے کمین اور معززین خاصی تعداد بھی شرکت کرتے تھے۔ عشاءِ نواب فیملی کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ جس کے بعد لوگ ہنستے مسکراتے گھروں کو لوٹ جاتے۔ اسی تقریب میں حصہ لینے والی طالبات کو پہلے دوسرے اور خصوصی انعامات سے نوازا جاتا۔ سب ہر سال اس موقع کے منتظر رہتے۔

رانی تمام تفصیلات سے آگاہ تھی اس لیے صدق دل سے دعا کر رہی تھی کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہوتا کہ "جشن بہاراں" میں شریک ہو سکے۔

پھر اُس کے حوصلے زندہ لوگوں میں زندگی سے بھرپور انداز میں شامل ہونے کی امنگ بہت سارے لوگوں کی بہت سی محبتوں چاہتوں اور بے پناہ خلوص اور بے ریا سلوک نے اُسے بستر عیال سے کھڑے ہو جانے کی توانائی بخش دی۔

چلے پھرنے کے قابل تو ہو گئی تھی مگر بے پناہ زرد چہرے اور غمناک حال صحت کی وجہ

ان سے کچھ نہ بولی۔

افروز جہاں جلدی سے بہمن کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”اللہ شاہ جہاں! لوگ تو بیمار
زیادہ حسین اور دل زبا ہو جاتے ہیں..... چلو ہم بھی بیمار ہو جائیں!“

شاہ جہاں اُس سے بھی زیادہ شرارت سے آنکھیں نہچا کر بولی۔ ”ہمارا تو یہ خیال
فوزی کہ اختر شیرانی نے کسی ایسے موقع کے لیے یہ مصرعہ کہا ہوگا کہ۔

مجھے نر جھائی ہوئی زرد کلیوں سے محبت ہے

دیکھاتم نے نر جھائی ہوئی زرد کلی کا تم! واللہ! ہمیں تو رانی اسی مصرعے کی تشریح

مل رہی ہے۔“

افروز جہاں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”سچ کہتی ہو تم سے ایک سیڈنٹ سے
”قتل“ ہوتے ہوتے یہ مہارانی تو خود ہی ”قاتل“ بن گئی ہیں۔ اب تو اللہ وارث ہے
مارا۔“

اتنا کہنے کہتے ذرا سا محکوم کر معنی خیر انداز میں دائیں طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر
کے تعاقب میں دیکھتے دیکھتے رانی اپنی جگہ ساکت رہ گئی گویا پتھر کی بن گئی ہو
بالکل سامنے ہی۔ سفید کرتے پا چائے میں لمبوں سیاہ گھونگر یا لے بال سلجے
سے برائے ملی ایک حسین سی خاتون سے محو گفتگو تھے۔

”اوف! فوہ فوزی! تم نے رانی بے چاری کو پریشان کر ڈالا۔ وہ ویسے ہی بستر
ملاات سے اٹھ کر آ رہی ہے۔“ شاہ جہاں نے فوراً سی مداخلت کی پھر رانی کا ہاتھ پکڑ
کر سنجیدگی سے بولی۔ ”چلو رانی! ہم تمہیں دوسری مہمان خواتین سے ملوادیں۔ یہ فوزی
آج آپ سے باہر ہو رہی ہیں مارے خوشی کے۔“

رانی اُس کے معنی خیز جملوں پر غور کرتی ہوئی اُس کے ساتھ چل دی۔

مہمان خواتین میں معززین شہر کے علاوہ زیادہ تعداد اُس کی لچکر رز اور ظالبات

”قصر دیدار“ کے پائیں باغ کا وہ کشادہ اور وسیع لان جو ”کوشہ ارم“ کے
نام سے مشہور تھا اُس کے محور کن خوشبوؤں والے پھولوں کی بیلوں سے لدے
ہوئے گیٹ پر ہی افروز جہاں اور شاہ جہاں نے رانی کو استقبال کیا۔

اُن کے قریب بہت سی خادمائیں چاندی کے بڑے بڑے تھالوں میں سرخ
گلابوں کے چمکتے ہوئے ہار لیے کھڑی تھیں اور وہ آنے والی مہمان خواتین کا استقبال
ان ہاروں سے کر رہی تھیں اس لیے جب ایک ساتھ گئی ہار رانی کے گلے میں پڑے تو
وہ پھولوں میں تقریباً ڈھکی ہوئی پریشان سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

افروز جہاں اور شاہ جہاں کے نفرتی قہقہے دیکھنے والوں کی مسکراہٹوں میں اضافہ
کر رہے تھے۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ زیب النساء بیگم نے آ کر دونوں کو ڈانٹا اور پھولوں کے
بوجھ سے جھکی ہوئی رانی کی پیشانی محبت سے پھوم لی اور بہت پیار سے اس کا احوال
پوچھنے لگیں۔ پھر دوسری مہمان خواتین کی طرف بڑھ گئیں۔

اُن کے جانے کے بعد رانی نے ان دونوں کو خبر لینے والے انداز میں دیکھا۔ مگر

ہلی ہلی تار کی پھلی ہوئی تھی۔ اس کھجے اندر سے مین علی کی اہلی اہلی مسکرائیں اور افروز جہاں کے دل نشین قہقہے اُسے زہر لگ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اٹھ جاتی یا کچھ کہتی صاحب زادی آگے بڑھی اور بڑی نرمی سے اُس کا ہاتھ تمام کر ڈرامائی انداز میں بولی۔ ”رانی! کہاں جا رہی ہو بھئی! ادھر آؤ۔۔۔ ان سے ملو یہ ہیں ہمارے بھیا! صاحب زادہ دیدار علی خاں۔۔۔ اور بھیا! یہ ہیں ہماری بہت ہی پیاری اور عزیز۔۔۔“ باقی بات اُس کے منہ میں ہی رو گئی۔

رانی کھڑے ہوتے ہوئے لہرا گئی تھی۔ پیش تر اس کے کہ وہ نیچے گرتی صاحب زادہ دیدار علی خاں نے جلدی سے اُسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔ ایک لمحے کے بعد رانی نے بند ہوتی ہوئی آنکھیں یہ وقت تمام کھولتے ہوئے۔ اس کی بانہیں بڑی طرح جھٹک دیں اور اُن کے بجائے شاہ جہاں پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالتے ہوئے پست آواز میں کہا۔ ”صاحب زادی مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔“



کی تھی۔ اُن سب نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکثریت حراج پرسی کرنے والوں کی خوب صورت چہرے مسکراتے ہونٹوں کھٹکنا تے قہقہوں رنگارنگ لمبوسات اور شریر مسکراہٹوں کے جلو میں ”جشن بہاراں“ کی یہ تقریب گویا اسم با مسکنی لگ تھی۔ خوش رنگ پھولوں کے مہکتے اشال پھولوں کلیوں کی ترتیب سجاوٹ اور زمینی سے طالبات کی نفاست سلیقے اور خوش ذوقی کا اظہار ہورہا تھا۔

ان تمام تردچسپیوں اور گہما گہمی کے باوجود رانی کو اپنا آپ خالی خالی سا لگتا تھا۔

علی اُسے مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر نظر آئے تھے۔ کئی مرتبہ تو صاحب زادی افروز جہاں کے ساتھ ہتے مسکراتے دکھائی دیے۔ ایسے موقع پر بے پناہ حیرت و تجسس ’عجب دکھ اور ایک نہ سمجھ میں آنے والی کیفیت کے زیر اثر رانی کے دل دھڑکنیں کبھی تیز اور کبھی بالکل سست ہو جاتیں۔

علی اور افروز جہاں سے اپنی علیحدہ علیحدہ دوستی باتیں اور ملاقاتیں اور اب اُس منظر کا خیال کرتی جو اس نے نیم بے ہوشی میں دیکھا تھا تو مزید الجھ کر رہ جاتی۔ یہ سارے نظارے دیکھتے دیکھتے بلا خراس کے اعصاب جواب دینے لگے اُسے محسوس ہوا کہ اگر وہ کچھ دیر مزید اسی ہنگامے میں شامل سوچتی رہی تو پاگل ہو جائے گی۔ سب کی نظروں سے بچتی بچاتی وہ ایک گوشے تہائی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھا کر بیٹھ گئی۔

خبر نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ کئی لمبے جلمے قہقہے سن کر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ صاحب زادی افروز جہاں اور شاہ جہاں کے درمیان علی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

”گوشہ دارم“ کے اس گوشے میں پھولوں کی بیلوں اور جھکی جھکی ٹہنیوں کے سہارے

اپنیوں میں مشغول ادھر ادھر ٹولیوں میں بے ہوئے تھے مگر پھولوں سے بھرے
بے جھکی جھکی ٹہنیوں والے اس تنہا گوشے میں موجود یہ تینوں بہن بھائی دکھ اور
الی سے ہاتھ مل رہے تھے۔

صاحبزادی افروز جہاں اُسے ہلاٹھلا کر بولی۔

”ہائے اللہ بھیا! یہ تو بے ہوش ہو گئی۔“

علی کو بے اختیار اُس کا ایکسڈنٹ یاد آ گیا۔ اُس روز بھی بے ہوش رانی کو معلوم
اکس جلدوجہد سے اُنھوں نے اسٹریک کے درمیان بُری طرح پھنسی ہوئی
تھ میں نکالا تھا۔ مگر اُس دن اور آج کے حالات میں واضح فرق تھا۔

اُس روز وہ ایکسڈنٹ کے صدمے سے زخمی ہو کر بے ہوش ہوئی تھی۔

مگر آج تو..... بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آرہا تھا۔

علی کے حساس دل نے اُس کی اچانک بگڑ جانے والی کیفیت کو پوری طرح
ل کیا۔ اُنھیں اپنی بہنوں کے علاوہ خود پر بھی شدید غصہ آیا۔ مذاق ہی مذاق میں
غریب کی جان پر ہنسنے لگی تھی۔ اُنھوں نے بے سندھ پڑی رانی کے قریب اکڑوں
ا ہوئے بہنوں کو ہلکی سی ڈانٹ پلا دی۔

”ہو اُس کے قریب سے۔ ہوا لگنے دو۔ اور شور مچانے کی کوشش مت کرو۔“

شاہ جہاں ڈرتے ڈرتے بولی

”بھیا! اسے کسی طرح..... اندر لے چلیے۔“

”خاموش رہو۔“

اُنھوں نے سختی سے منع کر دیا۔ پھر ذرا تھم کر بولے۔

”اگر ممکن ہو تو کہیں سے پانی لیکر آؤ۔“

علی کے موڈ سے دونوں سہم سی گئیں۔ انہیں پُپ لگ گئی۔ کاہے کو کبھی بھائی سے

صاحبزادی شاہ جہاں کا دل دھک سے رہ گیا۔

رانی کا تو ذرا ہی کیا تھا! اُس نے بے اختیار رانی کو دونوں باہوں کے حلقے میں

سمیٹ لیا اور بدحواسی و گھبراہٹ کے عالم میں چیخ پڑی۔

”بھیا! بھیا!..... دیکھئے! اسے کیا ہو گیا؟“

علی جو اُس کے جھڑک دینے سے پیچھے ہٹ گئے تھے گھبرا کر دوبارہ اُس پر جھک

گئے مگر اتنی ہی دیر میں رانی شاہ جہاں کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی سبزے پر ڈھیر

گئی۔

میں تو ان معاملات میں بھی ٹوٹنے والی نہ تھی

کوئچ اپنی ڈار سے یوں چھوٹنے والی نہ تھی

کوئی تو ایسا سبب تھا زندگی کے درمیان

ورنہ اپنے آپ سے میں روٹنے والی نہ تھی

ورد کی آواز مدھم اور مدھم ہو گئی

وہ زمین و آسمان میں گونجنے والی نہ تھی

”گوشہ ارم“ کی مہک آور فضاؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مہمان اپنی

ڈانٹ کھائی تھی۔ تاہم پانی کی جستجو میں ادھر ادھر دیکھا۔

بلکی بلکی تاریکی میں اُجلی اُجلی رانی ابھی تک اپنے آپ سے غافل پڑی تھی۔
تے پھولوں کی سی نرمی سے اُسے سنبھال کر شیخ پر لٹا دیا اور پریشانی کے عالم میں
زوال سے اُسے ہوا دینے لگے۔

لے جانے کو تو وہ اسے اندر لے جاتے کسی نہ کسی صورت سب کی نظروں سے
کر۔ لیکن اُس کے الفاظ دل پر نقش ہو چکے تھے۔

”صاحبزادی۔ مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے.....“

علی اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے خوب واقف تھے اس لئے مجبوراً
اندر سے اُن کو سخت ملال تھا۔ حالات پہلے سے بھی زیادہ گھمبیر ہو گئے تھے۔
خود کو مجرم سمجھ رہے تھے اور دل میں سخت ناموس اور شرمسار تھے۔ اُس کی اہلیہ
بے ہوشی نے اُن کے حواس قفل کر ڈالے تھے۔ وہ دم بخود تھے کہ اب
کریں؟

مگر جلد ہی قدرت نے اُن کی بے بسی کا مجرم رکھ لیا اور شاہجہاں کا
ہوا پانی ابھی اُنہوں نے اُس کے چہرے پر چمڑکا بھی نہیں تھا کہ اُس
آنکھیں کھول دیں۔ حواس بیدار ہوتے ہی اُس کی ناک سے پھولوں
کلیوں کی بھنی بھنی مست خوشبو نکل آئی جس نے عمدہ اثر ڈالا۔ تاہم وہ ہمہ
اُجالے اور تاریکی کے سنگم نے شناخت کی صلاحیت کو تھوڑی تک
رکھا۔

”مم..... میں کہاں ہوں؟“

اُس کے منہ سے بہم سے الفاظ نکلے۔ علی جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔
دونوں اُس پر جھک گئیں۔ شاہجہاں خوش ہو کر بولی۔

”مولا تیرا شکر ہے یہ ہوش میں تو آئی۔“

افروز جہاں محبت سے اُس کے پسینے پسینے ہوتے چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولی
”رانی! یہ کیا پتہ بند ہی ہے! اٹھو بھئی۔ یہ کیا۔ باتیں کرتے کرتے ہی سو گئیں۔
بھی خند۔ لو یہ پانی پی لو۔“

افروز کی آواز سن کر وہ واقعی اٹھ بیٹھی اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔
اُسے دکھائی نہ دیئے تاہم پانی پی لیا اُس نے۔ خشکی سے مطلق رنج رہا تھا۔ اتنی ہی
لہو نٹوں پر چڑیاں جم گئی تھیں۔

اُس بحال ہوئے تو قفل ٹھکانے آئی۔ اصل قصہ ذہن میں تازہ ہوا تو دل پسینے
اری سے دھڑکنے لگا۔
ایک دفعہ بھر وہ غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جیسے کسی کی حلاشی ہو..... تبھی نگاہ
ل کر رہ گئی۔

سو جیسے کے باغ و بہار کج میں علی کھڑے سگریٹ سلگا رہے تھے۔ پوری حقیقت
روز روشن کی طرح واضح ہوتی چلی گئی۔

اُس کی تیوری چڑھ گئی۔ ادھر سے رخ پھیر کر شاہجہاں سے کہا۔

”براہ کرم اپنے ڈرائیور سے کہئے وہ مجھے میرے گھر چھوڑ آئے۔“

”ہاں ہاں۔ بھی چلی جانا۔“

افروز نے فوراً اُسے دلا سہ دیا۔

”ابھی تو وقت ہی کیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر نہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“

”کیوں؟ یہاں کیوں؟“

”ڈرائیور گاڑی لگا رہا ہے۔ ان کو سوار کرا دو۔“

وہ ہدایت دے کر ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں ”قصر دیدار“ کے شاندار پھانک سے ایک کار رانی کو لیئے ہوئے نکلی تو اُس کے تعاقب میں چپکے سے دوسری گاڑی بھی حرکت میں آ چکی تھی جسے صاحبزادہ دیدار سلطان ڈرائیو کر رہے تھے۔

انہوں نے رانی کی شرط تو پوری کر دی تھی مگر..... اپنی تمنا بھی پوری کر لی تھی۔



اُس نے تیوری پر بل ڈالے ڈالے ٹپک کر رہ چھا۔

”مجھے نہیں بیٹھنا یہاں۔“

مارے جھلاہٹ کے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”ارے..... ارے“

وہ دونوں بوکھلا کے اُس کے ارد گرد آ گئیں۔ شاہ جہاں کی زبان سے نکلا
”ابھی ڈرائیور قبل دشمنوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب تو
بیوقوفی دیکھو۔ نہیں بھی نہیں اس وقت ہم تمہیں کہیں نہیں بھیجیں گے۔ سید
ہماری خوابگاہ میں چل کر آرام کرو۔“

”کہہ دیا نہ میں اپنے گھر جاؤں گی بس۔“

اُس نے بدستور بگڑے بگڑے تیور سے کہا۔

”ٹھیک ہے اگر آپ لوگوں کو بھیجنا منظور نہیں تو میں بس سے چلی جاؤں
وہ جوش ہی جوش میں اُن دونوں کے حلقے سے نکل کر چند قدم آگے بڑھ
راہ میں علی کھڑے تھے۔ غم و غصے کی زیادتی سے وہ پوری جان سے کانپ
مگر شکست مان لینے والوں میں سے وہ بھی نہ تھی۔ سانس دھونکی کی طرح چا
محسوس کر رہی تھی کہ اگر مزید ان لوگوں کے درمیان رہی..... تو شاید
تیور اگر گر پڑے گی۔

علی اُس کی کیفیت سے ڈر گئے۔

”شاہ جہاں!“

انہوں نے دھیرے سے بہن کو مخاطب کر کے کہا۔

تھوڑی دیر بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بستر پر اٹھ بیٹھی۔

پوری کوٹھی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔

ذہن کے در پہ پر آج شام کا واقعہ اپنی پوری تجویزات کے ساتھ دستک دینے لگا۔ وہ تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر ایک استغراق کے عالم میں بیٹھ گئی۔

کس قدر حیرت انگیز اور ناقابل یقین حقیقت پر سے پردہ اٹھا تھا۔ یعنی علی محض ملی نہیں دراصل صاحبزادہ ویدار علی خاں تھے!

ان تینوں نے مل کر کتنا طویل ڈرامہ رچایا تھا اس کے ساتھ!

رانی کورات کی ان بے چین گھڑیوں میں گزرا ہر ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا علی نے اس سے اپنی اصلیت کس خوبی سے چھپا کر ایک عام انسان کا رول ادا کیا تھا۔ اور اس کے گھرانے میں رفتہ رفتہ اس حد تک رسائی حاصل کر لی تھی کہ گھر کا ہی ایک فرد شمار ہونے لگے تھے۔ وہ لتاں بنی مایا مریاں اور شرمین سے ان کی دوستی! بے نظمی اور اپنائیت!! اور پھر خود رانی سے جو ایک تعلق خاطر تھا وہ علاحدہ ہی احساس کا حامل تعلق تھا۔

”آف خدا یا!“

وہ اپنا پنج ہاتھ پیشانی پر رکھ کر بیوی بڑائی

”کتنا بیوقوف بنایا اس شخص نے مجھے۔ میں کیا سمجھتی رہی اور وہ کیا نکلا؟ میں اس کی نظر میں اس قدر کم مایہ اور ارزاں تھی کہ مجھ سے مسلسل جھوٹ بولا گیا۔ مسلسل مجھ سے جھوٹ موٹ کا ڈرامہ کر کے لطف اٹھایا گیا۔ مزہ لیا گیا۔

آہ! مجھے ظالم نے تماشہ بنانا چاہا۔ اور وہ شاہجہاں اور افروز جہاں!!“

رانی کی زروح تک نچلس گئی۔

گھر پہنچ کر رانی کی پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ وہ اپنی ضد کی پکی نگی اور ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی آئی تھی۔ زیب افسانہ بیگم سے اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی اس نے اب ان تینوں نے اس بارے میں انھیں کیا کہہ مطمئن کیا ہوگا؟ رانی کو پرواہ نہ رہی تھی۔ بس اچانک ہی غم و غصے کے زیر اثر اس کے سارے فیوز اڑ گئے تھے۔

کئی گھنٹے مسلسل غور و فکر کے بعد اس کی حیرت قدرے کم ہوئی اور صدمے کا زائل ہوا تو اسے اپنی بزدلی اور اعصاب کی کمزوری پر شدید غصہ آنے لگا۔ آخر کیوں اتنی کمزور طبیعت ہو گئی ہے کہ خواہ تھوڑی دیر کیلئے سنی کیوں اپنے ہوش و حواس پر کنٹرول نہ دے سکی! وہ جھنجھلا جھنجھلا کر سوچنے لگی

”بھلا بے ہوش ہو جانے کی کیا تنگ تھی؟ ایسا کیا ہوا دیکھ لیا تھا مرنے؟ اگر اسی طرح وہ ہر حادثے ہر واقعے اور ہر ہرٹزی کو محسوس کرتی رہے تو اس دنیا میں رہنے کے قابل ہی کب رہ جائے گی! بے جس لوگ یوں احساسات سے کھیلنے اور جذبات کو روندتے گزرتے رہیں گے۔ اللہ میر

دنیا میں کیا نہیں ہو جاتا! اچھے بُرے واقعات اور حادثات کسی کو بھی پیش آ سکتے ہیں تو پھر کیا بچھاڑ کھا کر مر جاتا چاہئے!!

اپنی ذات کا مشاہدہ اور تجربہ اُس کی آنکھیں کھول گیا۔

چار دن کی مختصر رخصت میں اُس نے کئی بڑے فیصلے کر ڈالے۔ بڑی سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ اُس نے اپنی زندگی گزارنے کے چند اصول وضع کئے اور دل میں حویہ کر لیا کہ اب بہر صورت انہی اصولوں پر عمل پیرا رہنا ہے۔

علی نے صاحبزادہ دیدار علی خاں ہوتے ہوئے بھی اُس کے گھر کے اندرونی ماحول تک جس طرح کی رسائی حاصل کر رکھی تھی اُس نے جی ہی میں طے کر لیا کہ اُس کو یہ زیادتی بھی بہر صورت برداشت کرنی ہوگی۔ اور اب یہ دیکھنا تھا کہ اس انکشاف کے بعد خود اُن کا رویہ کیسا رہتا ہے؟

دل و دماغ قدرے سنبھل سکون ہو گئے۔

چار دن کے بعد وہ پابندی سے کالج جانے لگی اور اپنے روزمرہ کے معمولات میں پوری طرح غرق ہوتی چلی گئی۔

”تصویرِ از“ سے اُس نے اپنے طور سے جیسے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اُس طرف سے بھی حیرت انگیز طور سے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ ہوا۔

اُسے زیب النساء بیگم اس حد تک بے نیازی لگتی تھیں گویا تماشہ معاملات سے لاعلم اور بے خبر ہوں!

حالانکہ رانی کے دل کو پتا تھا کہ وہ علی کی سازش سے آگاہ ہیں۔

چند دن بخیریت گزر گئے۔

مگر جلد ہی خود ساختہ خاموشیوں کا سکوت فونسنے لگا۔

بڑے لوگوں کے خلاف اُس کا دل شکوؤں اور شکایات سے لبریز ہو گیا۔

تھوڑے ہی تھوڑے ہٹ میں اگلی صبح اُس نے چار دن کی چھٹی کی درخواست کا لکھ بھیجی۔ ویسے طبیعت بھی بہت گری گری سی ہو رہی تھی۔

صد سے پہلے صد۔ شک۔ پہلے شک۔ آخر کو تھی تو ایک نرم دناؤ کی سی لڑکی سی حالات کی ستم ظریفی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ ایک ناگوار سے سکوت نے اُس کی پوری ذات کا احاطہ سا کر رکھا تھا ان دنوں وقت ملا تو اُس نے بڑی سچائی سے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ ایک باشعور سمجھدار اور کبھی ہوئی لڑکی کی طرح اپنا تجربہ خود کیا۔ سوچوں اپنے خیالات تصورات اور زاویہ نظر پر کھٹے میں اُس نے کئی دن اور راتوں عرصہ صرف کیا۔

وہ کیا چاہتی ہے؟

کیا درحقیقت اندر ہی اندر کسی دلی تعلق نے اُسے نیم جان کر رکھا ہے؟

اُس نے لگا لایا ہوا پروپوزل رو کیوں کیا؟ جو کچھ انھیں جواب دیا تھا اگر

وہی ہے تو۔۔۔ اب تڑد کس بات کا تھا؟

آخر وہ کیا چاہتی ہے؟

علی کی حقیقت کے راز پر سے پردہ سرک جانے سے وہ ملول کیوں ہو گئی؟

اور وہ بھی اس حد تک کہ صد مہ بن کر نروس سسٹم مجروح کر گیا؟

علی ایک شخصیت کے بجائے صاحبزادہ دیدار علی خاں ثابت ہو گئے تو کیا ہوا؟

اگر وہ اسی طرح بیمار پڑتی رہی تو قضا اور شر میں کیا جے گا؟

رانی کو اپنے کمزور اعصاب پر سے بے حد شرم اور ندامت محسوس ہوئی۔

بے شک! اُس کی شخصیت کی نوٹ پھوٹ میں اُس کے والدین کی عاقبت

اندیشی اور آپس کے اختلافات کا زبردست دخل تھا تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ

اب "تصردیدار" سے بار بار اُس کے نام پیام آنے لگے۔ کسی روز بلاوے پر بلاوا آ جاتا۔

کبھی صاحبزادی افروز جہاں نکلا رہی ہے تو کبھی شاہ جہاں کا نامہ آ پہنچا کالج میں ان کی ملازمہ خاص بار بار آتی۔ رانی پیغامات سن سن کر تک آ جاتی مگر وہ بھی اپنے مزاج کی ایک تھی۔ بس سے مس نہ ہوتی۔

گھر میں یہ حال تھا کہ علی وقت بے وقت چلے آتے۔

مگر اب رانی نے اُن پر توجہ دینی چھوڑ دی تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کی صورت دیکھتے ہی اسے غصہ آ جاتا۔

انہوں نے بہانے بہانے بہت مرتبہ پہلے کی سی دوستی اور بے تکلفی کی فضاء قائم رکھی چاہی گویا کوئی نئی بات ہی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے مگر رانی ہر بار نہایت صفائی سے کئی کترا کر اُن کی کوشش تکام بنا دیتی۔

شرمین کے ساتھ مل کر وہ خوب بچوں کی طرح اودھم مچاتے ماسی مریاں کو چھیڑ چھیڑ کر کھیل باتیں کرنے اناں کے پاء ان سے ضیافت اڑاتے حسب دستور ہستے ہنساتے۔ لطیفہ گوئی کرتے۔ پہلے حالانکہ ایسا اتفاق کم کم ہوا کرتا تھا کہ وہ اُس کی موجودگی میں ضرور ہی آئیں مگر اب اپنی اصلیت گھل جانے کے بعد وہ خاص طور پر کالج ٹائم کے بعد بھی آنے لگے تھے لیکن رانی قطعی قابل توجہ نہ جانتی۔ بلکہ اُس نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ صرف علی ہی بنے رہنا چاہ رہے ہیں تو اُس نے بھی اناں کو حقیقت بتانے سے گریز کیا اور پُچھ سادھ لی۔

وہ کیوں بے کار میں نیا گھل کھلا کر اُن بے چاری کو پریشان اور ہراساں کرتی!

ہاں۔ البتہ اپنے طور پر یہ احتیاط برتنے لگی تھی کہ ادھر علی کی گاڑی گیٹ سے دکھائی دی اور وہ کچھلے گیٹ سے پڑوس میں چلی جاتی۔

اُس کی یہ بے گانگی اور غافل علی سے چھپ نہ سکی۔

رات کو اماں جان اور شرمین سو جاتیں تو اکثر فون کی گھنٹی بجنے لگتی..... وہ ریہور اٹھا کر مستقل کریڈل سے نیچے رکھ دیتی۔

شہر میں تو کیا! پوری دنیا میں ان تہارہ جانے والی ماں بیٹیوں کو کون جانتا تھا! یا ایسا بے تکلف اور نزدیک تھا جو آدھی رات کے سنانے میں بات کرنے کا مستحق ہوتا!

رانی نے اپنے گوشت پوست کے دل کو پتھر کر لیا تھا۔

اپنے تئیں سخت سے سخت ترین بن گئی تھی۔

وہ اتنی سی عمر میں وہ بڑے لوگوں کے بڑے ہتکنڈوں سے خوب واقف ہو گئی تھی۔ پوری طرح آگاہ تھی۔

اور ان ہتکنڈوں سے چھوٹنے لوگوں کے دلوں میں پڑ جانے والے بڑے بڑے سوراخوں، زوچ میں چپکتی دراڑوں اور پھر ان سے ساری زندگی کے رستے بہتے اور سکتے زخموں سے واقف ہو گئی تھی جو انسانوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے ہیں۔

اتنی ہی عمر میں اُس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا۔ اب کسی سے دھوکا کھانے کا حوصلہ باقی نہ رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ابو اور اناں جان کی بے جوڑ شادی اور پھر اُس کی ناکامی کا نچوڑ بن کر رہ گئی تھی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا، پرکھا اور سمجھا تھا اُس کا اثر اس درجہ تلخ اور کڑوا تھا کہ وہ نیچے سے اوپر تک تھنیوں اور کڑواہٹ کا ڈھیر بن کر رہ

گئی تھی۔

زندگی کے چہرے کا خوبصورت اور دلکش رخ اس نے دیکھا تھا، نہ اس کی لطافت اور رنگینی سے لطف اندوز ہونے کی جس اس کے وجود میں بیدار ہوئی تھی۔



موسم بہار اپنا اپنا جلوہ دکھا کر زو پوش ہو چکا تھا اور اب ماحول خزاؤں کی لپیٹ میں تھا۔

تمام تمام دن شدید گرمی رہتی۔

گھٹن اور خیس سے دم گھٹتا رہتا۔ سارا دن پسینہ دھاروں دھار بہتا۔ بھری دوپہر میں ہواؤں کے کوئی جھوٹے چلتے بھی تو وہ بھرپور گرم لو کے تھیزے ہوتے۔ جن سے جسم و جاں مزید تھلس اٹھتے۔

کسی کسی دن تیز آنکھی چلنے لگتی۔ مٹی اور گرد و غبار کے بولے اٹھتے اور فضا میں مزید آداسیوں اور ویرانیوں کی نذر ہو جاتیں۔ طویل دن اور سنسان دوپہریں کانٹے نہ کہتیں۔ استغانات سے فارغ ہو کر شرمین تو آرام سے گھر بیٹھی تھی مگر رانی ابھی تک مصروف تھی۔

مٹی کا چلچلاتی ڈھوپ سے لبریز اور گرم لو کے تھیزوں سے بھرپور مہینہ سر پر سایہ نکلن تھا اور ابھی کالج بند ہونے میں کافی دن تھے۔ جب تک گرمی کی

مال کو دیکھ کر شرمین سے کہنے لگے:

”دیکھو بے بی! کس قدر خوبصورت اور دلکش مسجد ہے۔ پتہ ہے یہ روٹھے
اور دوست کو منانے کے کام بھی آتی ہے۔ ایسے لوگ جو اندر سے تو دراصل اپنے
اوتے ہیں مگر اوپر اوپر سے فخر جتے ہیں۔ میرا بھی ایک دوست ہے۔ بہت پیارا
یار اس۔ بس یونہی ذرا آج کل روٹھا ہوا ہے مجھ سے۔ کیا خیال ہے خیر یہ لوں اس
کیلئے؟ اتنی حسین اور یادگار مسجد دیکھ کر شاید اس کا فصد کم ہو جائے اور وہ مجھے معاف
کر دے۔“

شرمین نے اُن کی لمبی چوڑی تمہید پر توجہ نہ دی اور فس کر بولی۔

”ہائے علی بھائی! آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم! یہ مسجد کب ہے؟ یہ تو تاج محل
ہے۔۔۔۔۔ تاج محل!“

”اوہ۔۔۔۔۔ دوسری سواری“

وہ نکلیوں سے رانی کو مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولے۔

”بس تو پھر ہم یہاں بی کے لینے خریدے لیتے ہیں۔ اس روٹھے ہوئے
دست کو کسی دوسری ترکیب سے منائیں گے۔“

رانی کی قوت برداشت اب جاتی رہی۔ اُس نے سارے شوپنگ بیگز اکٹھے کر
کے کیلئے ہی سنبھالے اور سینٹر سے نکل کر تیز چل دی۔

اُسے شرمین کی نا اہلی پر سخت غصہ آ رہا تھا جو لاکھ آنکھیں دکھانے کے باوجود
نہی سے چمکی ہوئی گھوم رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں بھی لدے پھندے پیچھے آئے۔

رانی اسٹریٹ پر ہاتھ رکھے سخت بیزاری سے لب بھینچے بیٹھی تھی۔ اُسے شہوت
سے شرمین کا انتظار تھا۔ علی کو دیکھ لے کر کوئی ہنسی چاہ رہا تھا ایک سیکنڈ کے

تعلیقات کا آغاز ہوتا اس وقت تک تو شاید بازاروں میں لان کا ایک چرس بھی
باقی نہ رہتا۔ اتنا جان نے کتنے ہی دنوں سے موسم کے لحاظ سے کچھ سامان کی
فہرست دے رکھی تھی مگر کالج سے آنے کے بعد رانی پر تھکاوٹ اور سستی کا اس
غلبہ ہوتا کہ شام گئے تک آنکھیں کھولنے کو جی نہ چاہتا۔ اوپر سے گرمی کی
شدت!

بہت سارے دنوں کی ٹال مٹول کے بعد ایک روز لٹاں سے زبردست پھٹکار
گئی اور اُس کی تمام سستی ہو گئی۔

اگلی شام رانی اور شرمین شاپنگ کی غرض سے بازار آئیں تو پہلی ہی دکان پر
علی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

وہ معلوم نہیں سلیز مین سے کیا کہہ رہے تھے ان دونوں کو خود سے قریب پاکر
حیرت اور خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔

رانی کا سارا موڈ عارت ہو گیا۔

جانتی تھی اب ان سے جان چھوٹی ممکن نہیں۔ تاہم وہ لائق سی ہو گئی۔
پوری توجہ اور دھیان سے لٹاں کی مطلوبہ اشیاء کی فہرست چیک کر کر کے
خریداری کرتی رہی۔ اپنے اور شرمین کے علاوہ ماسی مریاں کیلئے لان کے کئی کئی
سوٹ خریدے۔

علی حسب توقع ساتھ ہو لیے تھے۔ اُن کی بہترین دوست شرمین جو ہمراہ تھی اس
لئے رانی اُن سے ہمکلام ہوتی نہ ہوتی، اُنہیں کیا فرق پڑتا تھا۔ ہر طرح کا تیصرہ
نہایت روانی سے سنا اُسے رہے تھے اور بظاہر اُن کی غناطی شرمین تھی۔

رانی دل ہی دل میں جل بھن کر خاک ہوئی جا رہی تھی۔

ایک گفٹ سینٹر پر شوکیں میں رکھے ہوئے سفید دودھیاء جگمگاتے تاج محل کے

شارت کی اور آندھی طوفان کی طرح گھر پہنچ کر دم لیا۔ وہ تو ٹھمت ہوا کہ لتاں جان
ایسوں کے ہاں گئی تھیں اور ماسی مریاں پر خند طاری تھی۔ ورنہ بغیر شرمین کے اُسے
کو کر دسیوں سوال کر ڈالتیں۔

اپنے کمرے میں گھس کر اُس نے تمام سامان چٹا اور بیڈ پر لیٹ کر ان اتفاقات
کو سننے لگی جو بدقت تمام حاصل کردہ سکون تکٹ کر گئے تھے۔ علی کی مسلسل ڈھٹائی پر
ت زودہ بھی تھی۔

”خبر نہیں کیا چاہتے تھے وہ!“

کیا اب تک انہیں اپنے طویل ڈرامے سے اکتاہٹ نہیں ہوئی تھی؟
مزید اور کتنا تماشا بنانا چاہتے تھے اُس کی ذات کو! بہت ہی ارزاں اور کم مایہ سمجھا
میں نے مجھے! کاش! لتاں جان نے انہیں اپنی سادگی ہی سادگی میں ہمارے گھر
کے اندرونی عید نہ دیئے ہوتے!

چونکہ ہمارے باپ نے ہمیں وعادی اور بھائی کوئی ہے نہیں اس لئے وہ ہمیں جی
انے والا کھلونا سمجھتے ہیں!!“

لافتناہی سوچوں میں مستغرق اُسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب کسی نے اندر
مل ہو کر ایک جگہ پانی اُس پر انڈیل دیا۔

ساتھ ہی علی کی گھمبیر آواز ابھری۔

”زیر علی بزنس مین یاد آ رہے ہیں کیا؟“

ایک تو ان کی اچانک حرکت اوپر سے زیر علی کا ذکر.....

چڑھی ہوئی وہ پہلے سے تھی اس لیے ایک دم ہمزک اٹھی۔

اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بدتمیزی سے بولی۔

”آپ کو شرم آتی چاہیے ایسی بات کہتے ہوئے۔ اور یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

بھی ہزارویں حصے میں یہاں سے نکل بھاگے۔

شرمین علی کے ساتھ ساتھ سڑک کر اس کر کے آئی تو اُس نے علی کو نظر انداز کر کے
بہن کو مخاطب کیا اور فرنٹ ڈور کھول کر بولی

”چلو بیٹھو جلدی سے۔ آج سو سو کے چل رہی ہو کیا؟“

شرمین ہنس پڑی۔ اُس نے چاہا کہ رانی کے برابر بیٹھ جائے علی نے پک
اُس کا ہاتھ تھام لیا اور جلدی سے بولے۔

”چلو بے بی آئیں کریم کھلا لائیں دیکھو کس غضب کی گرمی ہے۔“

پھر ذرا سا تھم کر رانی پر اک شرارت آمیز نگاہ ڈال کر اضافہ کیا۔

”آف وہ..... چہرہ تو تمہارا لال بھجھو کا ہو رہا ہے۔ چلو چلو۔ جلدی سے چلو۔ خشکی
ٹھنڈی آئیں کریم موٹہ بحال کر دے گی۔“

رانی خوب جان رہی تھی وہ اُسے غصہ دلا رہے ہیں۔ حقیقت میں اُسے تاؤ بھی
بہت آ رہا تھا۔

مگر براہ راست ان کے منہ لگنا نہ چاہا وہی تھی۔ ضبط اور تحمل کا دامن تھامے
تھامے شرمین کو ڈانٹنے لگی۔

”تم..... بہت بیوقوف ہو شرمین! آج تو بے ہودگیوں کی حد ختم کر دی ہے
نے۔ آؤ بیٹھو جلدی سے..... بہت آئیں کریم ہے آگے۔“

”ارے..... کس سنگر کے کہنے میں آ رہی ہو بے بی۔“

علی فوراً درمیان میں آ گئے۔

”ان کے غصے سے تمہاری آئیں کریم کو بخار آ جائے گا!“

اتنا کہتے کہتے شرمین کو بڑے ڈالار سے اپنی گاڑی کی طرف کھینچ لے گئے۔

رنج اور پیش کی زیادتی سے رانی کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اُس نے گاڑی

شریف انسانوں کے بھی انداز ہوتے ہیں؟“

اُس نے اپنے کیلے بالوں اور بھیکے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن علی پر اُس کے بھڑکنے کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ مسکرا کر بولے۔

”میرا کونسا اُن زبیر علی بزنس مین سے نکاح ہونے والا ہے جو میں شہ
باقی رہی بات بے ہودگی کی۔ تو جناب! یہ حرکت بے ہودہ نہیں بلکہ عین حما
ہے۔“

”بہت خوب۔“ رانی نے زہر خند ہو کر پوچھا۔

”اس عقل مند میں کوئی راز کی بات پوشیدہ ہے؟“

انھوں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے سوچا۔۔۔ انکار بے بہت دہک رہے ہیں منجھاؤ لوں گا۔“

وہ صاف اُس کے غصے اور گرمی سے جھٹکتے رخساروں پر چوٹ کر گئے۔

رانی بالوں سے ٹپکتا پانی جھٹک کر چینی۔

”ہر بات سے انجوائے کرنا تو خوب آتا ہے آپ کو۔ بہرہ پے کہیں۔“

اتنا کہہ کر باہر کی طرف لپکی۔

دفعتاً علی جھپٹے۔ اور دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُسے دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کیا

اُن کی جسارت پر گلہ رہ گئی۔

علی کے چہرے پر ایک عاقبت درجے کی سنجیدگی چھا گئی تھی۔ ہل بھر:

موڈ بدل گیا۔ آنکھوں میں سچائی کا پرتو تھا۔

چہرے کے ایک ناقابل بیان تاثر کے ساتھ انھوں نے اُس کے آ۔

ہاتھوں جوڑ دیئے اور عاجزی سے گویا ہوئے۔

”رانی! خدا کیلئے مجھے اب تو معاف کر دو۔۔۔ میں بہت نادوم ہوں۔ اپنے گزشتہ

بے اور طرز عمل پر۔ خدا گواہ ہے جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا اور تم نے

التماء کالج کا ذکر کیا تو تمہاری قربت اور ملاقات پر بہت خوشی ہوئی تھی اور جی

دہچ لیا تھا کہ بہت جلد تمہیں سچ بات سے آگاہ کر دوں گا مگر جب میں نے اُن

چٹائیوں (افروز جہاں اور شاہ جہاں) سے متہ کرہ تو وہ دونوں اڑ گئیں اور محض

نستائے کیلئے اتنی لمبی پلاٹنگ کرٹیں نہیں۔ پھپھو جانی (زیب النساء بیگم) کو بھی

ن نے منالیا تو۔۔۔ تو۔۔۔“

”تو آپ نے بھی انجوائے منت کی ٹھان لی ہے۔۔۔ یہی نا!“

رانی نے طنز بھرے انداز میں نوک دیا۔ اور اُن سے دور ہو کر بولی

”آپ بیکار تھی لمبی۔ تفصیل بیان کر کے اپنا بھی اور میرا بھی وقت ضائع

ہے ہیں۔ میں نے کوئی شکوہ کیا؟ شکایت کی؟ خوب جانتی ہوں کہ بڑے

ایونٹ میچوں نے لوگوں سے انجوائے کر لیا کرتے ہیں وقت گزاری اور کچھ

کے شغل کے طور پر کبھی کبھی بھرپور بھی بھر لیا کرتے ہیں۔ براہ کرم میرا

بھوڑ دیئے۔“

”رانی!“

وہ زری طرح تڑپ گئے۔

”لہذا! ایسے طرز مت کرو۔ اتنے بڑے تکلف لہجے میں۔“

اُن کی بات درمیان میں رہ گئی شرمین زور زور سے پکارتی چلی آ رہی تھی اسی

علی نے نکلیوں سے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”میں بھی ایک ایسی یادگار بنواؤں گا لتاں زندہ جاوید لوگوں کیلئے۔“
 رانی نے ایک قہر آلود نگاہ اُن پر ڈالی اور گوصتی ہوئی اُنھ کو باہر چلی گئی۔



علی گھبرا سے گئے جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئے اور برش
 بالوں میں کرنے لگے۔

”تم کب آئے علی میاں؟“

لتاں جان نے اندر داخل ہو کر در یافت کیا۔

علی سے پہلے شرمین فیک پڑی۔

”دیکھئے لتاں بھائی آپ کے لیے کیا لائے ہیں؟“

علی پر اب تک رانی کی تلخ و ترش باتوں کا اثر تھا۔ اُنھوں نے بمشکل خواہ

اور ایک بناوٹی مسکراہٹ سے بولے۔

”آداب لتاں۔ یہ دیکھئے۔ یہ میری آپ کی مسجد!“

اُنھوں نے ایک بھاری سا ڈبہ کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

شغاف کا نچ کے اندر بڑی فنکاری اور مہارت کے ساتھ جڑا ہوا جگر

کرتا تاج محل دیکھ کر اماں کو اپنا آگرہ یاد آ گیا۔

اُنھوں نے آنچل سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

”ارے میاں! مسجد کا ہے کرتا تاج محل کہو۔ اللہ اللہ! کیا شہر تھا۔ اپنا آگرہ

خدا کی شان! کیسے کیسے عظیم اور زندہ جاوید انسانوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ وا

جیز اصول لائے ہوئے!“ علی کی ساری افسردگی کا فور ہو گئی۔

اُن کے سامنے دو زانو ہو کر پوچھنے لگے۔

”آپ کو..... ممتاز علی کی یاد آ رہی ہے لتاں؟“ وہ آہ بھر کر بولیں۔

ہو بیٹا! ان آنکھوں نے محبت کی یہ یادگار قریب سے دیکھ رکھی ہے۔“

روٹی سٹیکتی ہوئی ماسی مریاں بڑے زور سے چوٹکیں۔

چنے سے پکڑی ہوئی روٹی لٹن میں رکھ دی اور علی کو بغور دیکھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے۔ لیوں پر ایک گھائل سی ہر سوز مکرہاٹ رز نے لگی۔

علی بھی پوری طرح انہی کی طرف متوجہ تھے۔

دھیرے دھیرے وہ اُن کی طرف بڑھیں پھر بے تحاشہ روتی ہوئی اُن سے چٹ گئیں وہ بھی ٹمکمار لولا کی طرح اُن کے بوڑھے شانے تھکنے لگے۔ اس وقت بہت متاثر لگ رہے تھے۔ جذبات کی شدت سے چہرہ جھٹکا رہا تھا۔

باہر کھڑی کھڑی رانی کو شاک یہ شاک لگ رہے تھے۔ ضبط نہ ہو سکا تو گردن بڑھا کر اندر جھانکنے لگی تھی۔

ماسی کی تحریروں زدہ رخساروں پر آنسو اک تواتر سے گر رہے تھے۔ علی نے جیب سے زرو مال نکالا۔ نہایت پیارا اور ملاکت سے اُن کے اشک پونچھنے لگے۔

ماسی مریاں کی بیگی بیگی بھرائی ہوئی آواز کپکپائی۔

”بیٹا! میں تم پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی چوٹک لگی تھی..... تم نہ تو نیکی بنائی اپنے باپ کی تصویر ہو..... جب وہ مجھے ملے..... بالکل یہی عمر تھی اُن کی۔ ایک نقش بھی نہیں چھوڑا تم نے اُن کا۔ میرے دل و غم نے بہت کچھ کہا تھا اندر سے مگر مجھے کوئی تصدیق نہ تھی۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ ایک شاد بیگم ضرور اُن کی نشانی ہے۔ سو اُسے اپنے قریب بیٹھا کر دیکھ لو۔ خود بھی ونگ رہ جاؤ گے۔ اپنی اور اُس کی مشابہت سے اب چوٹکنے کی باری علی کی تھی۔ جلدی سے کہنے لگے۔

”جی ہاں ہاں..... آپ نے مد کرہ کیا تھا۔ خوب یاد آیا۔ گویا ایک دو نہیں بلکہ تین عدد بہنوں کے بھائی ہیں ہم۔“

رانی کچن میں جاتے جاتے رک گئی۔

اندر سے علی اور ماسی مریاں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

معلوم نہیں وہ کب آئے تھے اور کچن میں کیا کر رہے تھے۔

وہ کان دے کر سننے لگی۔ وہ پوچھ رہے تھے۔

”ارے آپ کو جین نہیں ہے۔ کیا کرنے لگیں اس برستی بارش میں؟“

جواب میں ماسی مریاں کی آواز سی آواز سنائی دی۔

”ارے میاں اب کیا کرنے کو باقی رہ گیا ہیں! آج ساون بھادوں کی پنج تاریخ ہے نا ہمارے بابا (دالہ) کی بری کا دن۔ ہم باجرے کی روٹیاں پکا رہے انہیں بہت پسند تھیں۔ اسی پر فاتحہ دلائیں گے۔“

”او..... آئی سی.....“ علی کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

چند لمحوں بعد بڑے سکون سے صاف لہجے میں گویا ہوئے۔

”دوسرے لٹکوں میں یوں کہنا چاہئے کہ میرے اپنے نانا جان کی فاتحہ

آج۔“

ماں مریاں نہال ہو گئیں۔

مگر اپنی بات کا سرادو بارہ جوڑتے ہوئے بولیں۔

”تمہیں یہاں بیگم صاحبہ کے ہاں دیکھ دیکھ میں حیران ہوتی کہ آخر مجھے اس اپنے اپنے سے کیوں لگتے ہو! تمہاری بہت سے عادات اور رنگ ڈھنگ سے وہ ہو کر مجھے یقین کامل ہونے لگا تھا کہ میرا تمہارا کوئی نہ کوئی تامل ہے ضرور... مگر حقیقت ہونے کے باوجود یہ بات کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ چھوٹا مٹ بڑی بات۔ میرا! کون کرنا؟ اور تم سے کیا کہتی؟ یہ خدا شدا من گیر رہتا کہ خدا معلوم تم پر کیا اثر ہو میرا تھا ہر امان جاتے!

ماں مریاں بہت آہستہ سُرور میں بول رہی تھیں۔

علی نے ان کو بڑی سہولت سے ایک اسٹول پر بٹھا دیا تھا اور خود ان کے زکفر سے مگر گلزاران کی صورت تک رہے تھے۔

آج تو ماں مریاں کا خاموش ہونے کو جتنی تہ چاہ رہا تھا۔ ذرا ختم کر انھوں سانس بحال کیا پھر وہ بارہ گویا ہوئیں۔

”بیٹا! ایک روز جب میں تمہیں اور رانی بیٹا کو اپنی پوری زندگی کی روئے داد دے تھی تو ایسا میں نے خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

بے سبب اپنے ڈھکے چھپے اور بھولے بسرے ماضی پر سے نقاب نہیں سُرختے۔۔۔ ورنہ بیٹا! میں نے تو کبھی اصل واقعات اپنی ان بیگم صاحبہ یعنی (اماں!) نہیں سنائے ہیں۔ تمہارے سامنے میں یہ اقدام تمہارا ردِ عمل جاننے کیلئے کیا تھا اسی روز سے تمہاری طرف سے کسی پیشرفت کی منتظر تھی۔ لیکن تمہاری طرف جاہ طاری تھی۔ اب تو بلا آخر تھک ہار کر میں یہ سمجھے پر مجبور ہو گئی تھی کہ سب میری مصلحت ہے۔“

”جی ہاں۔ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔“

علی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”بسا اوقات بے درپے کے ناکام واقعات انسان پر مایوسی طاری کر دیتے ہیں رسیدگی سا دھی سچائی بھی مسخ ہو جایا کرتی ہے۔

آپ کی کہانی آپ کی زبانی سن کر واقعی میری خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی لی گئی۔ لیکن... درپردہ ایک خاص مصلحت تھی۔“

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہ کر دوبارہ گویا ہوئے۔

”آپ کی داستانِ حیات کے (End) اختتام نے مجھے نئی طرح چونکا دیا غا۔ پھر اُس وقت تو کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی تھی جب رانی کے اٹھ کر چلے

بانے کے بعد میں نے نام پوچھا اور آپ نے کہا تھا۔

”نواب ذوالفقار علی خاں۔“

کیونکہ حسن اتفاق سے میری یہ بی بی ولدیت تو تھی مگر حیرت انگیز طور سے ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی مٹا مٹا سا خاکہ ابھرنے لگا تھا۔ کیا! یہ پوری طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر میں شدید قسم کی الجھن اور کشمکش میں جلاوا ہو چکا تھا۔ اُسی دن سے ایک لڑیلگ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت بچپن میں کوئی بات سُنی تو تھی مگر تصدیق تھی۔

بہت غور و فکر کے بعد اچانک ہی ایک دن مجھے اپنے پھوپھا صاحب یاد آ گئے۔ میں نے اپنی زندگی کے طویل ماہ و سال لندن میں انہی کے زیر سایہ گزارے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ میرے انتہائی شفیق بزرگ ہیں بلکہ مہربان اور بے تکلف ساتھی بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ وہاں کسی موقع پر انھوں نے والد صاحب کی شادی کے تعلق کچھ کہا بھی تھا۔

پوچھنے کو تو میں شاید پھسچو جانی سے بھی پوچھ لیتا لیکن مجھے مکمل حالات کی تصدیق اور سند درکار تھی۔

آپ کو یاد ہوگا کچھ عرصہ قبل میں ایک ڈیڑھ ہفتہ حواہن غیر حاضر رہا تھا! وہ اس سلسلے کی کڑی ہے کہ میں از خود پھو پھا صاحب سے ملنے چلا گیا تھا۔

ماسی مریاں جو بغور ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ بے چین ہو کر بولیں۔ "پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"کیا ہونا تھا؟"

وہ معصومیت سے مسکرائے۔

"آپ ہی تو ہماری اماں جانی ہیں۔۔۔"

ماسی مریاں کو حیرت اور خوشی کے طے جلے احساسات نے جکڑ لیا۔ وہ ساکت گئیں۔

علی اپنے سفر کی وضاحت کرنے لگے۔

"میں نے تمام واقعے کی مفصل تحقیقات طلب کیں پھو پھا صاحب سے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انھوں نے تمام باتوں کی تصدیق کر دی اور مزید بتایا کہ "نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے ایک بہت بزرگ ملازم (جو اب انتقال کر چکے ہیں) انھوں نے اس سربستہ راز پر سے پردہ اٹھایا تھا۔ ویسے مرحوم کا مقصد کسی برائی یا غلط نظریے سے نہیں بلکہ یہ نیک خیال تھا کہ نواب صاحب کی اچانک وفات سے آپ بچی کے ہمراہ تھا اور بے سہارا رہ گئی ہیں۔ اس لئے آپ کی مناسب کفالت کی جائے مگر وقت کی قسم ظریفی ملاحظہ ہو کہ حقیقت آپ تک کسی دوسرے معنوں میں پہنچی اور آپ رات کے اندھیرے میں وہاں سے رخصت ہوئیں تو باوجود تلاشِ بیدار کے آپ کا کچھ سراغ نہ مل پایا۔

ہمارے ہاں کے وہ بڑے بزرگ ملازم جنہوں نے آپ کے متعلق پھو پھا صاحب کو اطلاع پہنچائی تھی دراصل وہ صاحب تھے، جن کے ذریعے نواب صاحب آپ کو ماہانہ اخراجات وغیرہ پہنچایا کرتے تھے۔ ان کے سوا دوسرا کوئی اس معاملے کا ازدان نہ تھا، نہ گواہ۔ ان کی زبانی پھو پھا صاحب کو صرف اتنی تفصیل معلوم ہو سکی تھی کہ نواب صاحب کسی موقع پر اپنے کسی دیرینہ دوست کے انتقال پر تعزیت کے لیے ہاول پور ساکنہ پر گئے تھے۔ اتفاق سے میت دفن کی جا چکی تھی۔ چنانچہ وہ فاتحہ کے لیے برستان تشریف لے گئے۔ بعد کے واقعات کی تفصیل ہمیشہ پردے میں رہتی۔ اگر آپ از خود نہ بتاتیں۔ اور یہ بھی اتفاقات ہیں زمانے کے۔

چنانچہ اب تو سید میسی حقیقت یہ ہے کہ آپ ہماری اماں جانی ہیں۔" اتنا کہتے کہتے وہ ماسی مریاں کے سامنے جھک گئے۔

ماسی نے محبت و شفقت کے بے پناہ جذباتوں سے مغلوب ہو کر انہیں کلیجے سے بنالیا۔

یوں گویا برسوں کے گھڑے ماں بیٹے کا ملن ہوا۔

ماسی کی آنکھیں بادلوں کے ساتھ ساتھ سادہ بھادوں پر ساری تھیں۔ خود علی ہی آبدیدہ تھے۔ دفعۃً چونک کر بولے۔

"بس بہت دن رہ لیں آپ ادھر ادھر۔ میں جلد ہی پھسچو جانی سے بات کروں گا۔ پھر یقیناً آپ کو ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے پھسچو جانی خود آپ کو لے کر جائیں گی۔"

"نہیں بیٹا"

ماسی مریاں نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔

"اب زندگی کے اس موڑ پر پہنچ کر جبکہ زیادہ وقت گزر چکا اور کم رہ گیا۔ معلوم

میریاں نے جو ایک روز اسے اور علی کو اپنی آب جتی سنائی تھی وہ رانی کو بھی حرف بہ حرف یاد تھی۔ بتایا قصبے سے اب آگاہی ہو گئی تھی اس عجیب و غریب داستان پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔

اُس کی عقل حیران تھی کہ اتنے بڑے نواب کی بیوی ایک معمولی سے گورکن کی بیٹی ہو سکتی ہے!

اور ذرا علی کا حوصلہ دیکھو۔ کس دل گردے سے جدوجہد کر کے تمام قصے کی از سر نو تحقیقات کیں۔ سچ جھوٹ کی جانچ کرنے کیلئے سب سے چھپ کر ایک طویل سفر کیا اور آج.....

اُسی ماسی میریاں کو کس عقیدت اور احترام کے ساتھ "ماں" کہہ کر گلے لگایا تھا۔ تھی نہ حیرت ناک حقیقت!

رانی کے پورے جسم میں بار بار سنیناں سی دوڑنے لگیں۔ اگر جو وہ خود اپنے کانوں سے ہر بات سن کر نہ آ رہی ہوتی تو ہٹا کد اُسے یقین کرنا محال ہو جاتا۔ اتفاق سے جس دن ماسی میریاں نے گوار کی پھلیاں توڑتے توڑتے اپنی کہانی سنائی تھی علی کے ساتھ وہ بھی موجود تھی۔ اور بڑی دلچسپی سے ان کی حکایت سنی رہی تھی۔

اُس کے جی میں بار بار اُبال سے اُٹھ رہے تھے کہ دوڑ کر جائے اور لبتاں جان کوڑھوٹھوٹھاٹھ کر یہ انکشاف سنا ڈالے۔ ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا..... مگر..... علی کی وارننگ پیر کی بیڑی بن رہی تھی۔



نہیں کب زندگی کی شام ہو جائے۔ تم ان دبی ہوئی چنگاریوں کو دبا ہی رہے دو۔ میری اپنی نیگم صاحب کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔ تم نے چاہت سے ماں پکار لیا، میرے لیے یہی بہت ہے۔ بس گھر میں کسی سے ذکر مت کرنا۔

"جی۔ ہرگز نہیں۔"

وہ فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئے۔

"ایسا قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ نے مجھے اتنا بے حریت اور گرا ہوا سمجھا ہے؟ ابھی تو مجھے آپ سے اپنی بہن کا نام پتہ دریافت کرنا ہے۔ بتائیے وہ کہاں ہیں؟"

"اے نہیں بیٹا! وہ فوراً خوش آمد پر آئیں۔"

"وعدہ کرو تم ایسا کچھ تو دہنیں کرو گے! معلوم ہے اس طرح لوگ خبر نہیں کیسے کیسی باتیں کریں! کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔ مثل مشہور ہے۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا سکتا ہے، کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اس لیے تحمل سے کام لو، تحمل سے۔"

علی نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ کسی کی کیا مجال دخل اندازی کرنے کی!"

"خیر..... ابھی فی الحال تو جانے دو۔"

ماسی میریاں نے انہیں پیار سے سمجھایا۔

ان دونوں کے انکشافات اور نئی نئی باتیں پتھر کی طرح بنی رانی کے سن چڑے۔ احساسات پر سنگ باری کر رہے تھے۔

آخر کب تک کھڑی رہتی۔ وہ تیر کی طرح پلٹی اور جیسے تیسے اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔

اعصاب جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی ماما

رات کو تراویح چاروں مل کر پڑھیں۔

علی اب بھی آتے۔ شرمین سے دل لگی کرتے رہتے۔ اماں جان سے دلہن کی باتیں کرتے۔ بہت دنوں سے اب ان کی توجہ ماسی مریاں کی طرف زیادہ مبذول رہنے لگی تھی۔ گھنٹوں ان سے باتیں کیا کرتے۔ اگر وہ لان کے کسی درخت کے نیچے

ے کے ساتھ اپنی عمر سے زیادہ زیادہ باوقار لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم
نی کالج کی طرف جانے والی روش کی طرف چلی جا رہی تھی۔ نہ کسی کی پرواہ..... نہ
ن سے متاثر.....

”یا میرے خدا!“

علی نے سگی بچ پر بیٹھ کر بے اختیار سر تھام لیا۔

”اس پتھر میں جو تک کس طرح لگے گی؟ صلح کرنے کا کون کون سا طریقہ نہیں
مالیا..... مگر قدرت کو بھی رحم نہیں آتا..... میں بھلا اس اپنے آپ سے بھی بے خبر
لی کو کیسے چھوڑ دوں؟ کیسے نکول جاؤں؟ میں خاص طور پر اُسے کہیں تلاش کرنے
ا گیا وہ خود ہی مجھ سے آکرائی..... اب میں دل و دماغ کو کس طرح سمجھاؤں؟
نئے کتنے دن اسی خیال سے میں اُن کے ہاں جانا چھوڑ دیتا ہوں کہ شاید کسی طرح
سے مجھ کو لے پر قادر ہو سکوں مگر افسوس! صد افسوس کہ اس کے خیال کو ذہن سے نکال
تا ہوں نہ کوئی دوسرا دل و نگاہ میں سماتا ہے۔ پچھو جانی سیکڑوں چہرے دکھا دکھا کر
جز ہو گئیں!!“

پچھو بھی جان کا خیال آتے ہی اُن کے دماغ میں ایک تجویز کو نہرے کی طرح لہرا
ٹی۔

”وہ..... مارا..... بھاگ پٹی جی اور نہ پچھو جانی کالج کیلئے نکل جائیں گی۔“

انھوں نے پُر جوش انداز میں فضا میں منکا لہراتے لہراتے ”قصر دیدار“ کی
بانٹی عمارت کی طرف دوڑ لگا دی۔

رائی کا پہلا بیرونی ڈفری تھا۔

ساتھی لیکچرارز سے ملنے اور انڈینس لگانے کے بعد وہ لائبریری میں آگئی۔ گھر
سے لائی ہوئی کتابیں واپس کرنے کے بعد وہ کسی کتاب کی تلاش میں الماریاں چیک

روزوں کی وجہ سے آج کل دن میں خوب فرصت ہی فرصت ہوتی۔ کبھی تو
مریاں اپنے مہذب ماضی کی فخری پگھڑیوں کی سیر کرانے نکل کھڑی ہوتیں۔ بسا اوقات
لٹاں جان رائی اور شرمین کے پیچھے کی کوئی کوئی مٹی دل لگی کی یادوں میں کھو جاتیں
کسی کسی دن گاہے گاہے اُنھیں رعبہ بھیا کی یاد ستانے لگتی۔ آنکھ سے آنسو
کا تار بندھ جاتا۔ حالانکہ ماسی مریاں کو دیکھے بغیر ہی رعبہ بھیا کے نمین نقش اور ادا
سب از پر ہو چکی تھیں مکروہ نہایت تحمل اور بردباری سے دوبارہ سب تفصیلات پر
توجہ سے سنتے لگتیں۔ کبھی کبھار تو پوری دو پہر یہی تذکرہ ہوتا رہتا اور روزہ کٹ جاتا۔
پان نہ کھانے کی وجہ سے لٹاں بٹنا ہی پر بٹنا ہی لیتی رہتیں۔ آنکھوں سے
ڈھلکا بہتا رہتا اور اُن کا بیان جاری و ساری رہا کرتا۔

لیکن ایک بات ہے۔

بھال نہیں ہے کہ اگر کبھی بھولے سے بھی شوہر کا نام لے لیں!

بچیوں کے ملال کا خیال اُن کی زبان پر تالے ڈالے رکھتا۔

اتفاق سے چوتھے روزے پہلا جمعہ آ پہنچا۔

سفید براق کرتے شلووار کے سوٹ میں رائی جیسے براہ راست دل میں از

جاری تھی۔ نظر لگ جانے کی حد تک ڈر بالک رہی تھی۔

سادگی کا بھی اپنا ہی ایک منفرد حسن ہوتا ہے۔

لیکن وہ اپنی شخصیت کے جادوئی تاثر سے بے نیاز ہی رہتی تھی۔ اس وقت

جیسے ہی وہ انجن بند کر کے گاڑی سے اُتری لان کے آخری حصے میں ٹہلتے ہوئے

ٹھٹھک کر رہ گئے۔

اُن کی تڑپ نکالیں اس کھور دل لڑکی کے نکھرے نکھرے سراپے پر جم گئیں۔

میں دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ سرسراتے ہوئے سفید آنکھوں میں وہ اپنے بچ

لواہ ہے ہمارے دل میں تمہاری محبت اور ممتا اپنی بیٹیوں کی ہے۔“
 اتنا کہتے کہتے انھوں نے محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔
 ”کچ بچا بتاتا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنا دل ٹول کر یہ بتاؤ ہم نے جو کچھ
 لہا تمہیں اس میں مبالغہ آرائی تو نہیں لگی؟“
 رائی کو بے حد شرم اور عداوت محسوس ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس فیملی کی بے
 یاس محبتوں اور شفقتوں کے پھولوں سے اُس کی جھولی لبالب بھری پڑی تھی۔ ایسے
 بے لوث اور بے خلوص لوگ کہاں تھے بھلا؟

اُس نے احسان مندی کے احساس سے نکلیں جھکالیں دھیرے دھیرے سے
 الٹی۔

”میڈم!“

زیب النساء بیگم نے فوراً اُس کی بات کاٹ کر ڈانٹا۔
 ”خبردار..... ہم ”میڈم“ نہیں بلکہ تمہاری بھی پچھو جاتی ہیں اور یہ کالج نہیں
 بلکہ گھر ہے۔ ہاں اب کہو کیا کہہ رہی تھیں۔“
 اُس نے بدستور شرمندگی سے جواب دیا۔

”آپ کی نوازشوں، محبتوں اور مہربانیوں کو میں کبھی..... بھول نہیں سکتی..... یہ
 حقیقت ہے مجھے میرے اپنوں سے زیادہ آپ کی طرف سے شفقت اور خلوص کی
 بات ملی۔ ممکن نہیں کہ میں اس حصار سے آزاد ہو سکوں۔“
 دور کھڑے علی نے چونک کر اُس کے خنکے ہوئے سر کو دیکھا۔

دل میں خوشگوار سی دھڑکنیں سرسرا نے لگیں۔

زیب النساء بیگم ہوش ہو کر بولیں۔

”ان جذبول میں ہمارا کوئی کمال نہیں بلکہ قدرت نے تمہارے اندر کوئی ایسا سحر

کرنے لگی تھی کہ پہلا پیر ڈ آف ہو گیا۔
 وہ کلاس لینے کیلئے لائبریری سے نکلی تھی کہ پرنسپل زیب النساء بیگم مخالف
 سے تیز تیز چلتی ہوئی آئیں اور اس کا ہاتھ تھام کر گویا ہوئیں۔
 ”ادھر آؤ..... ہمیں تم سے ایک ضروری کام ہے۔“
 رائی نے اُنھیں سلام کیا پھر ادب سے جواب دیا۔
 ”میڈم! سیکنڈ ایئر میں میرا پیر ڈ ہے۔“
 ”انگج کر دیا گیا ہے۔“

انھوں نے فوراً جواب دیا اور اُن کا ہاتھ تھامے تھامے سیر حیاں اترنے لگیں۔
 رائی کا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پرنسپل صاحبہ اور یہ عجیب ساروتیہ!
 الجھن میں گرفتار تھی وہ۔

”آج ضرور کوئی خاص بات ہے!“

اُس کی چھٹی جس چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگی مگر وہ کشاں کشاں اُن کے
 ساتھ چلتی گئی۔ حتیٰ کہ دونوں ”قصر دیدار“ کے اندر داخل ہو گئیں۔ بڑی نشست کا
 پہنچ کر وہ مسکرائیں اور بالکل سامنے اشارہ کر کے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”وہ دیکھو۔ وہ رہے تمہارے تینوں مجرم۔“

رائی نے دیکھا! افروز جہاں اور شاہ جہاں کرسیوں پر نوکھا سامنے
 براہمن تھیں۔ اُس کی نظریں پھسلتی ہوئی علی پر تنگ گئیں جو درپے کے قریب کھڑے
 بظاہر پائیں باغ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

زیب النساء بیگم نے رائی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ مخاطب کیا
 کی آواز اور لہجے میں محبت اور شفقت کا پرتو تھا۔

”رائی بیٹی! ہم نے تمہیں کبھی شاہجہاں اور افروز جہاں سے کم نہیں جانا۔

بن گئے۔

پورے کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔

وہ پوری وضاحت کر کے چپ ہوئیں تو افروز جہاں اور شاہ جہاں جیسے سانس کے ٹپٹپی تھیں۔

”اب صورتحال یہ ہے کہ حقیقت پر سے پردہ اٹھانے والے بھی یہ لوگ خود ہی ہیں، پچھتاہٹا بھی خود رہے ہیں۔ انہیں سوائے لعنت ملامت کے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ شرارت کا بھوت اُترا ہے تو ہمارے پاس دوزے آئے ہیں سفارش کیلئے۔ اب ہم تم سے بھی کیا کہیں سوائے اس کے کہ چلو اب تم بھی ان لوگوں کی شرارت کو بھول جاؤ۔ نظر انداز کر دو۔ اور نہیں کچھ تو یہ سمجھ لو کہ تمہیں اپنا سمجھ کر یہ ڈراما کرنا انھوں نے۔

اب دیکھو پریشان کس قدر ہیں اور پریشان بھی!“

زیب النساء بیگم بہت دیر تک سمجھاتی، بجھاتی رہیں۔

ان باتوں کے سوا انھوں نے دوسری کوئی بات نہ کی۔

یہ سب لوگ اپنے اپنے مقام پر اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے رہے دخل کسی نے نہیں دیا۔ خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔

اصل میں تو آج کے اس واقعے کے ٹھکرک علی تھے۔ انہی کی پریشانی سے پریشان ہو کر وہ رانی کو ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اور تمام باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر علی گئیں۔

ان کے جاتے ہی سب سے پہلے افروز جہاں نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ اور صدقِ دل سے بولی۔

”اچھی مہارانی جی! اب تو ہماری خطائیں معاف کر دو نا! کب تک سزا دو گی۔“

مجھ دیا ہے کہ ہم سب تمہارے دیوانے ہیں۔ یہ لڑکیاں ہیں تو تم پر قہر ہوتی جاتی ہیں خدا کا شکر ہے کہ سب آپس میں شیر و شکر تھیں۔ بس! دھڑکچھ مڑے سے تم نے با آنا جانا چھوڑ رکھا تھا۔“

رانی خاموش رہی۔ کیا وضاحت کرتی! چپ چاپ بیٹھی رہی۔

زیب النساء بیگم نے ایک نظر اُسے دیکھا پھر خود ہی بولیں۔

”تمہارے ملال اور کھنچاؤ کو ہم بخوبی محسوس کرتے سکتے ہیں۔ بے شبہ تمہارا مان جانا برحق ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی اچھی اور سچی لڑکی ہوتی، اُس کا یہی رویہ ہوتا۔ لیکن ہم تمہیں بتائیں کہ صاحبزادے نے ہم سے سارے حالات پوری طرح کے ساتھ بیان کر دیئے تھے۔ اور بتایا تھا کہ کس طرح بس خراب ہو جانے کی بنا پر ایک شام تمہیں گھر چھوڑنے کیلئے گئے۔ تمہاری والدہ سے ملاقات سے ڈرانے سکھانے تک ہم ہر بات سے آگاہ ہیں۔ کوئی راز والی بات نہ تھی۔

ہم نے اس وقت چاہا تھا کہ تمہیں اندھیرے میں کیوں رکھا جائے؟ اگر اس ملاقات پر صاحبزادے نے نہیں بتایا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں بھی بآسانی بتا سکتا تھا کہ دراصل ”صاحبزادہ دیدار علی خاں“ ہی بھی علی بھی ہیں۔ مگر..... یہ دو آفتیں!“

انھوں نے ذرا سی دیر کو ختم کر ان دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دو آفتیں کسی طور نہ مائیں۔

انھیں معلوم نہیں کیا لطف آ رہا تھا۔ بلکہ تینوں نے لمبی پلاننگ بنا ڈالی۔

آج ہم سوچتے ہیں کہ اصل کوتاہی ہم سے ہوئی کہ ہم ان کے کہے میں آگے بس کیا کریں۔ یہ دھیان نہ آیا کہ ان کا تو لمبی کھیل ہو جائے گا اور دل تمہارا ٹوٹے ورنہ ہم سختی بھی کر سکتے تھے۔ مگر ہم سے بھول یہ ہوئی کہ ان کی راہ سے ہٹ کر بظاہر

شاہ جہاں نے بھی اُس تھکید کی اور خوشامد سے بولی۔

”دیکھو رانی۔ بھیتا بھی کتنے چپ چاپ سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک تو روز راد پر سے تمہاری خنکی۔ بس بھی اب برداشت سے باہر ہے۔ چھوڑو ساری تا اور صلح کر لو۔“

افروز جہاں اُس کے گلے میں باہیں جھانک کر کے بولی۔

”حسن اتفاق دیکھو کہ اس دفعہ چاند کی چودھویں کو بھیتا کی سالگرہ ڈھیروں کام ملتوی ہوئے پڑے ہیں۔ تمہاری ٹینشن میں کوئی کام بھی پایہ تکمیل پہنچ پارہا ہے۔ اب اتنی سنگدل مت ہو۔۔۔۔۔“

علی اب تک رخ پھیرے درجے میں کھڑے تھے۔

رانی کی مسلسل خاموشی پر اب اُن کی بے چینی شدید قسم کی کوفت اور جھلا میں تبدیل ہونے لگی تھی۔

بالآخر اُن کی ساری خوش مذاقی اور چھیڑ چھاڑ مجروح ہو کر سنگین قسم کا غم گئی۔

دفعہ اُنھوں نے نہایت شکایتی نگاہ پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رانی پر ڈالی اور زور سے پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔

لڑکیوں کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ قدرے سراسیمگی کی سی کیا میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔

لیکن.....

اُن کے جاتے ہی رانی بے ساختہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

اور بیک وقت اُن دونوں کے ہاتھ تمام کر اطمینان اور شرارت سے بولی۔

”بس آج میرا بدلہ پورا ہو گیا۔۔۔۔۔“

میری آپ کی کوئی رنجش اور ناراضگی نہیں.....

سب ٹینشن ختم.....

صلح شروع۔“

چند لمحات کے بعد تینوں کے قبضوں سے نشت گاہ میں پھلجڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔



مگر دوسری ستم ظریفی ما خطہ ہو کہ دوسرا فرمان پہلے۔ فرمان کا بھی جید امجد واقع ہوا تھا جو علی کی چھو جانی اور رانی کی پرنسپل محترمہ زینب النساء بیگم کی جانب سے جاری ہوا تھا۔

”اُس نامعقول اور نالائق کی ہرگز پرواہ نہ کی جائے۔ رانی بیٹی تقریب میں لازمی اور بہر صورت شریک ہو اور بغیر تجھے کے شریک ہو۔ اگر نہ آجائے تو زینب النساء بیگم کی شفقت و محبت سے خود کو آزاد جانے۔“

ان پے در پے عجیب و غریب باتوں نے رانی کو سخت کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ اپنی کوفت نے اُسے غم حال کر دیا۔

تاہم اُس نے تقریب میں شامل ہونے کو اذیت دی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے بغیر تجھے کے آنا بہتر خیال کیا۔ اس معاملے میں اُس کا غالب خیال یہی تھا کہ چونکہ اُس روز علی ناراض ہو کر بیرہنہ ہوئے گئے تھے۔ اس لئے بہنوں سے ایسا کہلایا ہوگا۔

چنانچہ اُس نے بھی سالگرہ میں کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ شامل بھی اپنی پرنسپل صاحبہ کی خوشنودی کے لئے ہونا چاہ رہی تھی۔ باقی کچھ وہ سمجھنا چاہ رہی تھی نہ سمجھنا۔

دراصل یہ معلوم ہونے کے بعد کہ علی درحقیقت ایک نواب زادہ ہیں وہ اندر سے ابر کر رہ گئی۔ سہم ہی گئی تھی۔

بڑے لوگوں کے بھیا تک زو پ اُسے ساری زندگی کیلئے سہا دینے کیلئے کافی تھے۔ وہ بہت ممتاز رہنا چاہتی تھی۔

چنانچہ اتنی بڑی اور اہم سالگرہ میں وہ جھلکتی سی آف وائٹ ساڑھی میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ بڑی سادگی سے چلی آئی۔

خوب صورت وقت، خوب صورت لوگ، خوب صورت تقریب اور خوب صورت خجگ والا معاملہ تھا۔

ظاہر ہے بڑے لوگوں کی تقریب تھی تو اعلیٰ ترین انتظامات بھی تھے۔ لیکن رانی کی زندگی کی عجیب و غریب تقریب تھی۔ اس لئے وہ قدرتی بات ہے ہو کھلا بھی رہی تھی کھلتا بھی رہی تھی۔ بھلا دنیا میں کوئی ایسی سالگرہ بھی ہوتی ہے جو بغیر تجھے کے منعقد ہو رہی ہو! پھر اس جھنجٹ کی تک کیا ہے! اس کی زندگی میں بھی پہلا چانس تھا کہ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود خالی ہاتھ آئی تھی بلکہ خالی ہاتھ آنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ اور مجبور کرنے والی حصین وہی دونوں صاحبزادیاں افروز جہاں اور شاہ جہاں۔

انہوں نے Invitation card کے ساتھ اُسے صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا تھا کہ۔

”بھیا کا حکم خاص ہے کہ ان کی سالگرہ میں رانی کی طرف سے کوئی تحفہ قبول نہ کیا جائے۔ اگر وہ نہ مانے تو صاحبزادے کو دکھایا نہ جائے۔“ اس تو جین آمیز ابتداء کے بعد کہاں ممکن تھا کہ رانی اس تقریب سعید میں اپنی تذلیل کروانے کیلئے آ پہنچتی۔

دیکھتے ہی پوئی۔

”رائی! ابھی سے جانے کی کوشش مت کرنا۔ بارہ دری میں امی حضور نکلا رہی

ہیں تم کو.....

پھر وہ اُسے خود بارہ دری کی سیڑھیوں میں پہنچا کر چلی گئی۔



سالگرہ کے انتظامات جس اعلیٰ پیمانے پر ہوئے تھے، تقریب پر اُس کا جوہن اور نکھار بھی اسی نسبت سے تھا۔

جدید انتظامات کے ساتھ ساتھ زمانہ اور مردانہ نشست و اُٹھ اگ لالان میں علیحدہ کر دی گئی تھیں۔ اندرونی قصر ویدار کے وسیع و عریض ہال میں تقریب کی اصل کاروائی کے انتظامات تھے۔ یوں بے پردہ خواتین کیلئے پابندی بھی نہیں تھی۔ مشترکہ گیٹ برابر استعمال میں تھا۔

خوش گپیوں اور نت نئی دلچسپیوں میں وقت پر لگا کر اُڑا اور مسرتوں کے پر شور ریلے میں سالگرہ ایک کاٹا گیا۔

میز پر تحائف کے لگے ہوئے انبار رائی کی طبیعت کھد کھدے دے رہے تھے۔ لاکھ لاکھ لاکھ کے باوجود اُسے بے حد سکی کا احساس ہوا جیسے وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر بمشکل دبائے رہی۔ اتنی رونقوں اور گہما گہمی کے باوجود دل اندر سے خالی خالی سا لگا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان ناچ ناچ کر سوال کرنے لگا۔

ساجز اوے نے مجھ پر ایسی پابندی کیوں عائد کی؟

فقط مجھ سے ایسی دشمنی.....؟

اور اس قدر نظروں سے گرا دینے والا احساس برتری؟

اپنی گاڑی تو وہ لے کر آئی تھی۔ کھانے کے فوراً بعد جبکہ احباب اپنی اپنی دلچسپیوں میں کھوئے تھے اُس نے گھر جانے کا قصد کر لیا۔

اسی خیال سے وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگی کہ کہیں اُس کی پرنسپل صاحبہ دکھا دے جائیں تو وہ اس دل آزار محفل سے نکل بھائیں۔

پوری تقریب میں علی نے تو اُسے نگاہ اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔ اس وقت جبکہ زرب افساء بیگم کی تلاش میں تھی شاہ جہاں خود اُسے ڈھونڈتی ہوئی آگئی اور

دونوں دیر دیر سے قدم سے قدم ملا کر چلتے گئے۔
 تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ بول پڑی۔
 ”کمال ہے کہاں چلی گئیں بلو اکر؟ مجھے واپس بھی جانا ہے۔“
 لیکن زیب النساء بیگم وہاں ہوتیں تو ملتیں!
 دم بدم بڑھتی رات سے رانی کو پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔
 ”چلتے ایک نظر وہ سامنے فوارے کی طرف دیکھ لیتے ہیں شاید وہاں ہوں۔“ علی
 نے سرسری انداز میں رائے دی۔

اب سوائے اس کے چارہ بھی نہ تھا۔ وہ بے سمجھے ہو جھے اُن کے ہم راہ اتنی
 دور نکل آئی تھی کہ تنہا واپس چلے جانا محال تھا۔ آس پاس کوئی دوسرا دکھائی بھی
 نہیں دیا تھا۔ یوں بھی ”قصر دیدار“ کے اس حصے میں آنے کا اسے پہلی مرتبہ
 اتفاق ہوا تھا۔

دونوں آہستہ آہستہ منحنیہ روش پر چلتے گئے۔
 چاند ابھر کر بالکل سامنے آ گیا تھا۔ فضا میں ایک پراسرار سحر سے دم بخود
 تھیں دودھیا چاندنی کی اعلیٰ اعلیٰ کرنیں ہر نظارے پر ثار ہونے لگیں۔ عطر ہیز
 ہواؤں کے جھونکے اُن کے آس پاس سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دونوں فوارے
 کے قریب پہنچ کر ختم گئے۔ رانی بے دھیانی میں بہ غور دیکھنے لگی۔ سرکری ٹیو بڑکی
 روشنیوں میں فوارے سے شفاف پانی کی جھاریں تپتے موتیوں کی بوچھاڑوں
 کی طرح برس برس کر بکھر رہی تھیں۔ بہت ہی سحر آفریں اور مستحیر کر دینے والا
 منظر تھا جو لمحہ بھر کیلئے دماغ کو مسحور کر دیتا تھا۔ رانی نے دل ہی دل میں گرجتے
 ہوئے سوچا۔

”یہ نظارے بھی بڑے لوگوں کی نگاہوں کو تراوٹ پہنچانے کیلئے ہیں۔ عام

”حضور رانی؟“
 کسی نے اُس کے شانوں پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اپنی طرف کھینچا۔ اُس کے من
 سے چیخ نکلتے نکلتے رو گئی۔
 علی اُس کے بہت قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔
 ”پیسو جانی کو... تلاش کر رہی ہو؟“
 رانی نے ناگواری سے خود کو اُن کی گرفت آزاد کیا۔ ہٹ کر جواب دیا۔
 ”میں کیا تلاش کروں گی باغ میں آکر۔ انھوں نے خود ہی بلایا ہے۔ آپ سے
 مطلب؟“ علی اُس کا چارہ ماندا از نظر انداز کر کے بولے۔
 ”بلایا تو مجھے بھی ہے۔ شاید ہم دونوں سے کام ہو۔ پیلیے ہم انہیں ڈھونڈ لیتے
 ہیں۔ میں بھی دوستوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔“
 پہلے تو رانی سے سوچا۔ ”انکار کروں!“ پھر کچھ سوچ کر ساتھ ہوئی۔

بیت جانے!“

رانی پوری جان سے چکیا کر رہ گئی۔

وہ اُس پر حریف جھک کر بولے۔

”آج تمہیں مجھے معاف کرنے کا انکار کرنا ہو گا یا اقرار..... تیسرا کوئی بھی

روئیہ ناقابل قبول ہے۔ باقی گناہ تم نے مجھے ہر پہل انکاروں پر تڑپایا ہے۔ اور ایک

یک لمحے کا بہت جان لیوا انتقام لیا ہے۔ اب بتاؤ! بولو! مجھ سے وہ کون سا ناقابل

معافی گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ تم نے بات کرنا ترک کر دی۔ میری ہزار خوشامد کا تم نے

آزہ برابر اثر نہیں لیا؟ مگر آج..... ان لمحات میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم آخر کب تک

زبان استعمال نہیں کرتیں۔ آج کی تاریخ میں میں نے بھی اپنے آپ سے عہد کیا ہے

کہ خواہ میری یا تمہاری جانوں پہ کیوں بن جانے۔“

رانی کے کانٹو لہو غدارو۔

اُن کی باتیں اور ارارے سن کر ساکت رہ گئی۔

اتنے عرصے کی ملاقات میں اُن کی ضد اور خود سری سے واقف تھی۔ خوب آگاہ

تھی کہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرنے بیٹھ جاتے تو تعجب نہ تھا۔

لمحوں میں اُس نے خود کو سنبالا۔ اپنے خوف اور نہ معلوم گھبراہٹ پر قابو پاتے

ہوئے جھگڑتے کا ارادہ کیا۔

اس تہائی کے ماحول میں وہ کسی رسک کیلئے تیار نہ تھی۔ یوں بھی اب اُس کے

دل میں اب ان کی طرف سے رنجش اور ملال نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اُس نے

بہت پہلے ہی دل کے بجائے دماغ سے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس راہ پر چلنا نہیں ہے اُس

کے کھوٹے ہونے کا ملال کیا؟

اُس نے نہایت سمجھداری سے کام لیتے ہوئے طبیعت پر اُن کی طرف سے

لوگوں کو اس سے کیا واسطہ؟“

اُس نے بادل خواستہ اصر سے نظریں ہٹائیں۔ کچھ کہنے کو تھی کہ اچانک علی نے

ایک گہری سانس لی پھر اُس کے بالکل سامنے آ کر پوچھا

”رانی! ایک بات سچ بتاؤ۔ کیا تم نے مجھے واقعی معاف کر دیا ہے؟“

اُن کے اچانک بدلتے رویے اور سوال سے رانی شہتا گئی۔

تاہم اصر اصر کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

”اس وقت ایسے سوال جواب کا کیا موقع ہے؟ چلیے واپس چلیے ہیں آپ کو

پھسوا جانی تو کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔“

علی نے آگے بڑھ کر کمال جرأت سے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور

قد رے سخت لہجے میں گویا ہوئے۔

”اُن کی تلاش چھوڑ دو۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہو گئیں۔“

یہاں دراصل تمہیں میں نے بلوایا ہے۔ ویسے گھبرانے کی ضرورت

نہیں۔ میں آدم خود نہیں ہوں۔ جو دریافت کر رہا ہوں اس کا صاف صاف

جواب دو۔“

رانی کے بے اختیار اپنے ہاتھ جھڑاتے ہوئے افسوس اور گھبراہٹ میں

کہا ”تو۔۔۔ یہ کہنے کا سارا چکر آپ کا چلایا ہوا ہے۔ بس چھوڑیے میرے ہاتھ

مجھے فوراً واپس جانا ہے۔“

”چھڑا سکو تو چھڑا لو۔“

علی نے بڑی دھونس سے کہا اور اُس کو تقریباً کھینچے ہوئے خوارے کی میز صوفوں

لا بیٹھایا۔ پہلی میزھی پر ایک پاؤں ٹکا کر قطعیت سے بولے

”تمہیں..... میں ہرگز جائے نہ دوں گا۔ خواہ اسی طرح پوری رات کیوں

طاری بے زاری اور انجانے خوف کو جھٹک دیا۔ یہ وہی علی تو تھے جن سے گھنٹوں ڈرائیو تک سیکھتی رہی تھی۔ جو آزادانہ اُس کے گھریلو ماحول میں دخل انداز رہتے تھے اور جن پر اُس کی اپنی ماں بے پناہ بھروسہ کرتی تھیں۔

یہ سب سوچ کر وہ تھوڑا مسکرائی اور مصالحتانہ انداز میں کہنے لگی۔

”آپ تو..... اس طرح معافیاں ملافیاں مانگ رہے ہیں جیسے بہت بھاری مجرم ہوں۔ اگر آپ کا یہی مقصد ہے تو میں بتاتی ہوں عائشہ افروز اور شاد جہاں نے آپ کو لاعلم رکھا ہے۔ میں نے اسی دن یہ معاملات فحش و ناراضگی کے ختم کر ڈالے تھے جس روز آپ کی پچھو جانی مجھے کالج سے اپنے ساتھ اندر لے کر آئی تھیں۔ آپ خود ہی..... ناراض ہو کر چلے گئے تھے۔“

علی کا چہرہ کھل اٹھا۔

بے پایاں دلی مسرتوں کا پر تو سوئی سوئی آنکھوں میں جاگ پڑا۔

بے ساختہ چمک کر پوچھا۔

”گویا..... تم نے مجھے معاف کر دیا؟ میں سمجھا تھا کہ وہ دونوں بک رہی ہیں۔“

کہتے کہتے وہ ایسے حیرے میں آئے کہ سرشاری کے عالم میں اس کے برابر میزمری پڑا بیٹھے اور بے تکلفی سے بولے۔

”ایسے ایک بات ہے رانی! اس طویل ڈرامے میں لطف بہت آیا۔“

افوہ! میں نے زندگی بھر کسی بات سے ایسا بھرپور انجوائے نہیں کیا۔ پہلے پہل تو تمہارے الجھنے کے خیال سے میں نے ان دونوں چیلوں کی مخالفت کی تھی اور یہی ارادہ تھا کہ از خود تم پر حقیقت کا اظہار کر دوں گا مگر اس وقت اُن دونوں نے میری ایک نہ چلنے دی۔ بعد میں تو پھر مجھے بھی..... حیرہ آنے لگا۔ یاد ہے تم کو وہ بارش والی سرد شام..... انہوں نے ذرا تھم کر زوردار قبضہ لگایا۔ شرارت

سے بولے۔

”اول تو بارش اور بجلی اور پھر بھیگ جانے سے تم بہت نردس ہو رہی تھیں۔ اوپر سے میری باتیں! ابھی واہ! حیرہ آ گیا تھا۔ پچھو جانی کے خلاف میرا کچھ کہہ دینا اور وہ تمہارا بھڑک جاتا..... میرے پاس وہ مکمل کیسٹ اب تک محفوظ ہے۔ تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سب ٹیپ کر لیا تھا میں نے!! تمہیں یاد ہے اور کیا سمجھاؤں!!“

رانی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

علی کو اس وقت بات بے بات لہنی آئے چلی جا رہی تھی۔ اُس کی حیرانگی سے خطا اٹھاتے ہوئے بولے۔

”میں..... تمہاری وہ باتیں پچھو جانی کو بھی سنوائی تھیں۔ اسی کے بعد سے تو وہ

تم کو..... بہت زیادہ چاہنے لگی ہیں۔“

رانی کچھ بول نہ سکی۔ اُن کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ اب اُن کی کن کن باتوں کا تراستانی! انہوں نے تو جیسے آج پھر بات کو اُس کی آخری حد تک پہنچانے کا حیرہ کر لیا تھا۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچے بیٹھے تھے۔

اپنی بے پناہ خوشیوں کے جنوم میں مسگریٹ منڈکایا اور گہرا کش لیکر پوچھا۔ ”سچ کہو رانی! جشن بہاراں کی شام تم افروز بے چاری سے اتنی چڑکیں رہی تھیں؟ نہ معلوم کیوں مجھے لگا کوئی خاص فحش ہے۔“

رانی کو ان کی یاد دہانی پر بہت کچھ یاد آ گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دفعہ وہ کہہ نزاری تاہم لہجہ کسی خاص تاثر سے خالی تھا۔

”شام آپ کا خیال ہے کہ آپ دونوں کو میں نے..... جشن بہاراں پر پہلی دفعہ ایک ساتھ دیکھا تھا؟ جی نہیں۔ بلکہ میں بہت پہلے ایک یاد رہ جانے والا منظر دیکھ چکی

تھی۔ البتہ "جشن بہاراں" کی شام سے قبل بس یہ سوچ کر رہ جایا کرتی تھی کہ ممکن ہے میرے ذہن و نظر کا فتور ہو۔"

علی الجبہ کر رہ گئے۔

سگریٹ سلکان چھوڑ کر اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

اب ستانے کی باری رانی کی تھی۔ اُن کی بے چینی سے لطف لینے لگی۔ خاموشی بیٹھی رہی۔

"کہو نہ..... کیا کہہ رہی تھیں؟" علی نے دریافت کیا۔

ان کی حیرت اور فکر مندی برقرار تھی۔

جب وہ ان کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے دیر سے دیر سے بتانے لگی۔ "مجھے اس رات کے لمحات۔ جب ایک سیٹنٹ کے بعد مجھے آپ "قصر دیدار" میں آئے تھے اور وہ شاید آپ کی خوابگاہ ہوگی۔ وقت تو معلوم نہیں مگر اچانک ہی میرا آنکھ کھل گئی۔"

وہ انہیں اپنی الجھن اور اسے عرصے پہلے کا دیکھا ہوا منظر بتانے لگی۔ علی کسی سو میں گم، پیشانی پر بل ڈالے سنتے رہے۔

بات کے اختتام پر بے اختیار انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"ارے دوست! تب تو تم نے بہت سی ذہنی اذیت برداشت کی..... جیجی! شدید بیمار پڑ گئی تھیں۔ اوما کی گاڈ! مجھ سے تو بہت زیادہ مختصر ہو گئی تھیں۔ اب سمجھو

آئی تفائل مسلسل کی وجہ۔ اویو قوف لڑکی! یہ سارے طوفان کانٹوں کی طرح دل کیوں چبھا لیے؟ مجھ سے تو پوچھا ہوتا! اور کیا تمہیں معلوم کہ تم اور افروز کو

ہونے کے علاوہ دودھ شریک بہن بھائی بھی ہیں!

رانی کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا۔

تاہم مسکرا کر جواب دیا۔

"بتانے یا پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ میرے اور آپ کے درمیان بے تکلفی ضرور تھی۔ مگر اس حد تک تو نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہونے لگیں۔"

"یہ دخل اندازی کی خوب رعنی" وہ سمجھے بغیر ہنس پڑے۔

"تم نے اتنی اہم اور بڑی بات دل میں چھپائے رکھی اور ہمارا حال ملاحظہ ہو کہ ان "زیر علی" سے تمہارے رشتے کی بات سن کر ہی ہم نے ان کی اپنی جان ایک کرنے کے ہزار منصوبے بنا لیے تھے۔ محض اسی وجہ سے "جشن بہاراں" پر میں جلد بازی سے کام لے کر حقیقت پر سے پردہ نوج پھینکا تھا۔ حالانکہ اس دن جو حدش مجھے تھا وہ بھی بالآخر وقوع پذیر ہو گیا تھا..... یعنی تمہاری طبیعت کا اچانک بگڑ جانا..... مت پوچھو کہ اندر سے کیا حال تھا میرا..... وہ تو کہو اماں جان نے اپنی سادہ لوحی میں خود ہی بتا دیا تھا کہ تم نے رشتے سے انکار کر دیا ہے....."

رانی حیرت اور تاسف سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

علی کی خوش گمانی، خوش گفتاری اور خوش فہمی پر اسے دکھ بھی ہو رہا تھا، افسوس بھی۔ شاید کیا کچھ سچ وہ سمجھ رہے تھے کہ زیر علی کے رشتے سے انکار رانی نے ان کی وجہ سے کیا ہے۔

رانی نے کھڑے ہوتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

"ان بے چاروں کو ہمارے گمراہ حالات کا کیا علم؟ ان کو کیا خبر کہ اپنوں سے ہی سے ہوئے لوگ ساری عمر کسی پر اعتماد کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ پھر موضوع لاتے ہوئے ہوئی:

"پتہ نہیں آپ یہ پرانی باتوں کا ذکر کیوں لے بیٹھے۔ یہ بتائیے سالگرہ پر تھو

لانے سے روک دینے میں کیا راز تھا؟ میرے بغیر کوئی بھی بغیر گفٹ کے آیا؟ اگر ع
ایسی ہی حقیر اور نا اہل ٹھہری انوائٹ کیوں کیا؟
دفعہ علی کا موڈ بدل گیا۔ چہرے کی شکلنگی اور تازگی سنجیدگی میں بدل گئی۔ وہ بیٹ
کہیں کھو گئے۔

رانی نے تعجب سے اس تبدیلی کو نوٹ کیا مگر بولی کچھ نہیں۔ جی کہ وہ اس
قریب سے اٹھ کر برے پر ٹپکنے لگے۔ سگریٹ کے پلکے پلکے کش لیتے رہے۔
ختم ہوتی سگریٹ نے انگلیاں جلائیں تو اسے دور پھینک دیا اور چونک کر
کے قریب آ کر کے۔

وہ جو اس کا موڈ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، قبل اس کے کہ مزاحم ہوتی، انہوں
جذب کی جانے کن منازل کو طے کرتے ہوئے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے دونو
تھوں میں دبایا اور مدھم مدھم سہروں میں بولے:

”رانی! آج اتنی۔۔۔ طویل کے بھی میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہارے
میں میرے لیے کیا مقام ہے؟ یہی سوال مجھ سے پچھو جانی نے دوسری طرر
تھا۔ لیکن جب میں ذاتی طور پر خود بھی اس سوال کے جواب سے آگاہ نہیں
توان سے کیا عرض کرتا۔ لیکن رانی! جب میں اپنے اندر جھانکتا ہوں اور
حالت کا اندازہ کرنا چاہتا ہوں تو میں اپنی کیفیت کس طرح بیان کروں؟
لفٹوں کا تمام خزانہ ختم ہو جائے مگر میں اپنا جذبہ، اپنا مدھما اور اپنا نقطہ نظر تم
بیان نہ کر پاؤں گا۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھ میں اس سلیقے اور حوصلے کا فقدان ہے میں تو بس ب
ہوں کہ۔۔۔ تم صرف اور صرف۔۔۔ میرے لیے تخلیق کی گئی ہو۔

میں پچھو جانی کو ان کے سوال کا جواب تم سے اس اہم ترین ملاقات

دینا چاہتا تھا۔

جب میں نے اماں جان کی زبانی یہ سنا کہ تم نے اپنے ابو کی خواہش کا
احترام دلکاؤ نہ رکھا اور اس پیغام کو رد کر دیا تو میرے سر پھرے جذبوں نے مجھے
پکار پکار کر یہی وجہ سمجھائی کہ یقیناً میرے لیے تم اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ
پھپھائے ہوئے ہو۔

یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں میں نے تمہارے ہاں آنا ترک کر کے دنوں
اپنے آپ کو ٹھوٹا۔ بیشک میری خاندانی روایات عام لوگوں سے مختلف ہیں، لیکن ایسی
بھی نہیں کہ مجھے اپنے ولی فیعلوں اور خوشیوں کی بحیثیت چڑھائی پڑ جائے۔ میرے
بزرگ اپنی اولاد کی مسرتوں کا گھاگھوٹنا نہیں بلکہ ان کی جھولی من چاہے پھولوں سے
آدنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اتنے دنوں کی دوستی نے یقیناً تمہیں بھی ان کی طرف
سے اطمینان دلا دیا ہوگا۔ ہم کھلے دل اور کشادہ ذہن لوگ ہیں۔ تعصب و نفرت یا بے
زور و تکبر ہمارے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا ہے۔

بت کی طرح ساکت بیٹھی رانی کے آس پاس سینکڑوں جلتے بجتے جھگوڑوں کا
اں تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وقت و حالات کا شمار تھا نہ
سنا۔

ایک سینکڑے سے بھی کم مدت تمہنے کے بعد علی دوبارہ بولنے لگے:

”آج۔۔۔ میں تم سے فقط یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ میں تم سے تمہارا
اشکار ہوں۔ میں تم سے تمہارا طالب ہوں رانی! خدا گواہ ہے میں تم سے
رٹ نہیں کر رہا، فقط تمہاری رضامندی چاہتا ہوں میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ
لے کر کیا ہے۔

یہ وہ فیصلہ ہے جس نے مجھے ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود ہر خرافات اور برائی

بیکڑوں ویپ ٹٹھانے لگے تھے۔

رات دیر سے میرے کچ کچ قدم بڑھارہی تھی۔

چاند جیسے بالکل قریب آکر نہیں ٹکٹے لگا۔

بھگی رات کے اس سے "قصر دیدار" کے پائیں باغ پر ایک گہرے سکوت کا

مالم طاری تھا۔ پتہ پتہ ہمدن گوش تھا۔ جیسے ہر کوئی کان لگا کر رانی کے فیصلے کے انتظار

میں ہو۔

لیموں کے جھلکے جھلکے بیڑوں میں سرسراہٹ والی ہواؤں کے جھوٹے رات کی

رانی اور مہندی کی دل نواز مہک کے ساتھ مل جل کر جیسے سحر آفریں سرگوشیاں کرنے

میں مصروف تھے۔

"دیکھ رانی! کسی کا اسگوں بھرا دل مت توڑنا۔ دیکھو! ذرا سنبھل کے!! ایہ

گناہ نہ سرزد ہو پائے تجھ سے، ورنہ یہ جان لے کہ پھر عمر بھر پھر بچتا دے کے

ویپ جلائے گی، جو حیرے ہی خون جگر سے جلیں گے اور پھر چلتے ہی رہیں

گے۔ محبتیں اور چاہتیں زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتیں، بلکہ کبھی کبھار ہی نصیبوں

سے ملا کرتی ہیں ان پاک لمحوں اور انمول گھڑیوں کو نعمت جان اور آگے بڑھ کر

دامن میں بھر لے۔ دیکھ ناشکری مت بن۔ ورنہ راکھ کے اڑتے ڈھیر کے سوا

کچھ نہ باقی رہے گا!!"

عین اس لمحے جب کہ وہ نکشش کے عذاب سے دوپار تھی تو زیر علی کا ان دیکھا،

اور قریب بیٹھے علی کا چہرہ اور چہرے کے نقوش اسے ایک جیسے لگنے لگے۔ گویا علی زیر

ہوں یا زیر علی ہوں۔ جیسے ایک ہی شخصیت کے الگ الگ نام ہوں!! اس کی نظر میں

یہ دونوں شخصیتیں اس کے ابو کی طرح اونچے عہدوں پر فائز اور اس کے لیے ناقابل

قبول تھیں۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

سے محفوظ رکھا۔ میں پیچھو جانی کو خود اماں جان کے حضور لے کر جاؤں گا۔ ان کے

سامنے اپنی درخواست دہرانے کے لیے۔ لیکن اس سے قبل تمہاری رضامندی اور خوشی

بلکہ اجازت درکار ہے۔

تم سے تھنڈا لانے کو اسی لیے کہا تھا کہ آج کے دن، میرے نزدیک سب سے

قیمتی، سب سے انمول اور سب سے گراں قدر تھنڈا تم خود ہو۔ آج تم سے۔ تمہی

مانگنے کا ارادہ ہے۔ مجھے مل جاؤ۔ پھر کسی فوت کی ہوس باقی نہ رہے گی۔ چونکہ

میری سالگرہ میں خالی ہاتھ آئی ہو، جبکہ تمہیں بھی یہی شکوہ ہے۔ کیونکہ یہ رسم دنیا بھر

ہے۔ اس لیے۔۔۔۔۔"

علی نے الفاظ اور صورے چھوڑ کر بے اختیار اس کا ہاتھ لیوں سے چھو لیا۔ رانی

خوش ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

نرم و گداز جذبات کی شبنم میں جھیکے جھیکے ہلکے ہلکے لہجے کی شیرینیوں میں ڈوب

ڈوبے اور احساسات کی سحر انگیز آغاج میں گلے گلے الفاظ رانی پر خوشبو سے اپنی چنگیز

ن کی مانند نچھاور ہو رہے تھے۔

ایک حسین، طرحدار، دولت مند، اونچی فیملی اور اعلیٰ ترین ایشیاس کا حامل

اس کا طلبگار تھا۔ بہت ساری محبتوں، بے شمار چاہتوں اور اپنے بھرپور پیار کا یقین

رہا تھا۔

لیکن رانی کی نگاہوں کے سامنے ابو اور اماں جان کے ڈوبے ابھرتے چہرہ

عکس گنڈہ ہونے لگا۔ منزل ہلک ہلک کر اسے گلے لگانے کو بے قرار تھی۔ سہ

ہو پہلا مستقل، بالکل قدموں میں پڑا جگمگا رہا تھا۔

اپنے الفاظ کا تمام تر خزانہ اس کے چہنوں میں ڈال دینے کے بعد علی

طرف منظر نگاہوں سے نکل رہے تھے۔ خوبصورت آنکھوں میں آس و ناس

”تو سے میں نے زیر علی کے رشتے سے انکار کیوں کیا تھا؟“

معا سے یوں محسوس ہوا گویا زمانہ میں برس آگے کی طرف پرواز کر گیا ہو۔ اماں جان کی طرح وحشت زدہ چہرہ گرد آلو بالوں کے ساتھ سوئی باہیں لیے تنہا کھڑی ہے۔ اور اس سے میلوں کے فاصلے پر علی کھڑے ہیں۔ مگر..... ان کے چہرے پر وہ کاچرہ فٹ ہے!

رانی گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا رانی!“ وہ بھی اٹھ کر اس کے برابر کھڑے ہو گئے۔

دودھیا، جھلکتی روشنیوں میں ان کی آنکھیں بیروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جن میں اس کے قرب کا اثر خوار بن کر تیر رہا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھامنا چاہا۔ مگر رانی صاف نظر انداز کر گئی۔ اور اس سے قدرے دور ہٹ کر آہستہ سے بولی:

”.....آپ کی ساری باتیں میں نے بغور سنی ہیں۔ ایسا مت جاننے کہ کان لیے بیٹھی تھی۔ مگر..... اس نے نگاہیں اٹھا کر علی کی طرف دیکھا، لیکن ٹھٹھک کر رک گئی۔ شاید کوئی جھجک آڑے آ رہی تھی۔

علی بے قرار ہو کر اس پر جھک پڑے اور بے تابی سے دریافت کیا:

”ہاں ہاں کہو..... بولو..... مگر کیا؟“

”کچھ نہیں.....“

رانی نے دبا دبا سا سانس لیا۔ پھر سمجھل سمجھل کر بولی:

”اس وقت تو..... آپ مجھے جانے دیجئے۔ یقین کیجئے میں باوجود کوشش کے بھی

کچھ نہیں بول سکتی۔ کل آپ کو میرا مفصل جواب مل جائے گا۔“

”مفصل جواب!“

علی متحیر ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔

”جی ہاں“

رانی نے ان سے نظریں ملائے بغیر دوبارہ کہا اور فوراً جانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

علی لپک کر اس کے راستے میں حائل ہو گئے اور پریشان ہو کر پرچھا:

”کیا ہوا رانی؟“ مجھ سے خفا ہو گئیں! دیکھو میں نے تو اپنے دل کی ہر بات صاف صاف تم سے کہہ دی ہے۔ اور معذرت بھی پہلے ہی کر لی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے تمہیں میری گزارشات گراں گزری ہیں۔“

وہ چپ رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

بتاؤ رانی۔ خاموش کیوں ہو؟“

علی دوبارہ اصرار کر کے پوچھنے لگے۔

”تمہیں میری..... کوئی جسارت بری لگ گئی؟ ویسے تو میں مانتا ہوں آج میری جراتوں میں بے باکی اور روانی تھی، لیکن یقین کرو کسی بات میں جھوٹ یا دل گلی کی ہلکی ترین رمت بھی نہیں تھی۔ بس میں نے اپنا حال دل کھول کر تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے۔ اب فیصلہ کا تمام تر اختیار بہر حال تمہی کو ہے۔ اسے اپنے قدموں سے روندھ ڈالو یا قدر رانی سے سنبھال کر رکھ لو۔

مگر یہ جو تم نے کہا کہ ”مفصل جواب“ تو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر ہو سکے تو

وضاحت کر دو۔“

اتنی دیر میں وہ پہلی دفعہ مسکرائی۔

”آپ تو بال کی کھال نکال رہے ہیں۔ کل آنے کی تو جواب بھی انشاء اللہ مل

جائے گا۔ ابھی تو آپ میرے رہنما بن کر راستہ دکھائیے۔“

”کیوں نہیں“ وہ اچانک صاحبزادہ ویدار علی بن کر سنجیدگی سے بولے:

”یہ رہنمائی آپ ہمیشہ کے لیے ہمیں سونپ سکتی ہیں، بے فکر ہو کر۔“



سنگی ستونوں اور چکنے چمکدار ٹانگوں والے ”قصر دیدار“ کے در و دیوار پر گہرا

سناٹا طاری تھا۔

آسمان پر گہرے گہرے سیاہ بادلوں کے پڑے جمع ہو رہے تھے۔ ہواؤں میں
سناٹا بٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ صبح سے ہی موسم کے تیور بدل گئے تھے۔ ایک دم ہی زیر
دست تھیر آیا تھا۔ مگر ”قصر دیدار“ کے کمین ہر تبدیلی سے بے خبر اپنی اپنی خوابگاہوں
میں بند خواب غفلت کے حرے لوٹ رہے تھے۔ جشن سالگرہ کے پُر رونق ہنگاموں
نے سب کو تھکا ڈالا تھا۔ رات تک جاری رہنے والے فنکشن اور جگہ کار کا نتیجہ تھا یہ بھی۔

جاگنے والے صبح سحری تک جاگے تھے اور روزہ رکھ کر نماز اور تلاوت کے بعد ہی
نیند آئی تھی۔ زہب النساء بیگم تو آج سرے سے کالج گئی نہ تھیں۔ حالانکہ وہ شاز و نادر
کبھی تعطیل کرتی تھیں۔

بادلوں سے بھرے بھرے آسمان تلے برقانی ہواؤں کے جھکڑوں نے اودھم مچا
رکھا تھا۔ سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ منہد کر ڈالنے والی فضا میں اُدگھ رہی
تھیں۔

سہ بارہ پھر پڑھنے لگے۔

ساتھ ہی ساتھ شدید قسم کی بارش نے آیا۔

شغاف و غمکین پر پانی کی جھاریں ٹوٹ کر بکھرنے لگیں۔ حد نگاہ تک لہرائی بل کھاتی ہوئی سرمئی سڑک بے حد بھلسنی ہو گئی۔ چنانچہ انھیں گاڑی کی اسپینڈ برائے نام کرنا پڑی۔ ٹریفک برائے نام ہونے کے باوجود بارش کی شدت اور جارحیت کے سبب لوگوں نے ادھر ادھر محفوظ مقامات پر پناہ لے لی تھی۔

تھوڑی دیر مسلسل چلنے کے بعد علی کو احساس ہو گیا کہ طوفانی ہوائیں اور دھواں دھار برقی بارش میں سفر جاری رکھنا ناممکن ہے۔ عاجز آ کر انھوں نے بھی گاڑی سڑک سے اتار کر برگد کے ایک گتھے بیڑ کے نیچے کھڑی کر دی۔

انجن بند کرتے ہی ذہن کا اسکرین روشن ہو گیا۔

نگاہوں کے زو پار کسی کاسٹورم آنکھوں والا سرخ سرخ چہرہ چلتے بچھے لمحوں کے پار لوہے لگا۔

تمتھاتے رخساروں پر وینکی ہوئی بادلوں کی ٹنوں سے دل و نظر لپٹے جا رہے تھے۔ انھوں نے گہرا کر چاروں طرف نگاہیں گھمائیں۔

وہ امنڈتی گھمنڈتی گھٹائیں.....

موسلا دھار برستائینہ.....

کڑکتی چمکتی آسانی نکلی.....

سُخ کر ڈالنے والے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ..... اور..... گتھے برگد کا یہی یادگار بیڑ!

جس کے نیچے اس روز بھی وہ پناہ گزین ہوئے تھے!

مگر آج، ان لمحات میں رانی نہیں، بلکہ رانی کا تھوڑا سا وجود تھا۔

علی کی اور رانی کی دوسری یادگار اور طویل ملاقات ایسے ہی طوفانی و برقی موسم

”شاداب خان!“

انھوں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

”تھیں یہ لفافہ..... کون دے کر گیا؟“

اُس نے قہر تھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”جج..... جی..... صاحبزادہ..... وہ کالج کا چہرہ اسی تھا جناب!“

”اوہ.....“

اُن کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

مگر فوراً ہی فیصلہ کن انداز میں گویا ہوئے۔

”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ اور ہاں ہماری گاڑی باہر نکلواؤ۔“

”جی بہت بہتر“

شاداب خان کی جان میں جان آئی۔ وہ تیزی سے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب ان کی گاڑی ”قصر دیدار“ کے عظیم الشان پھانک

نکل رہی تھی تو دور بظلوں میں ہاتھ ویئے کھڑا شاداب خان دل ہی دل میں بچھتا تھا۔

”کاش! میں صاحبزادے کو روک سکتا!“

آج موسم کے تیور بہت زیادہ بگڑے ہوئے ہیں۔

آج یقیناً میری شامت آکر رہے گی!!“

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ وہ تو کہو زیب النساء بیگم اپنی خواب گاہ میں بی

ہوا ستراحت تھیں، ورنہ حشر ہو جاتا مگر صاحبزادے کو اس کڑے موسم میں گاڑی د

ملتی۔

پھانک سے نکلنے ہی علی کی گاڑی کو طوفانی جھکڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے

وہ در پیچے کے ٹھنڈے ٹھنڈے نیشیوں سے ناک ٹکائے دیر سے برستی بارش کا لف اٹھاری تھی۔

ناجی گاتی بوندوں کا جل ترنگ روح میں اتر رہا تھا۔ مگر خود کے اندر..... دور تک ایساں منہ نہ بڑائے نیشی تھیں..... جانے کا ہے کو!

شرمین کے ریکارڈ پلیئر پر چلے سروں میں حدیثہ لوگ رہی تھی۔

یو ہے باریاں تے نال کنڈاں پ کے

آواں کی حواہن کے

”ہیلو!“

علی بالکل اس کے کان کے قریب مگلتائے

رائی اچھل پڑی۔

گھوم کر دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رو گئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ ایسے بر فانی م اور حواں و حار برستی رت میں بھی لوگ نکل پڑیں گے!

”کیوں؟ کوئی بھوت نظر آ گیا کیا؟“

لاکھ سنجیدہ ہونے کے باوجود وہ جھپٹنے سے باز نہ آ سکے۔

رائی نے سنبھل کر برستے بادلوں کی طرف اشارہ کیا اور ہر جتہ جواب دیا:

”انسان تو گھروں سے نکلنے سے رہے ایسے وقت!“

”بالکل ٹھیک..... قطعی درست۔“

علی نے خڑکی پر خڑکی جواب دیا۔

”بعض ایسے ہی بادلوں بھری اور بخ رت میں کوئی“ بھتی ”سڑک کنارے

رہی ہو تو وہی“ بھوت“ اسے گھر پہنچاتا ہے۔“

لیوں پر چٹک اٹھنے والی مسکراہٹ چھپانے کے لیے تھوڑا سا رخ بدل لیا۔

میں ہوئی تھی۔ اور آج تک ان کے دل پر نقش تھی!

علی کا موڈ یک لخت بدل گیا۔

”قصر دیدار“ سے رواں گئی والی ساری تیزی و طراری وحشت اور اضطراب دھیمہ پڑتا چلا گیا۔

گھر سے جن طوفانی جذبوں کے تحت چلے تھے، اس کے زور و شور اور روانی میں از خود کی واقعہ ہونے لگی۔

بالآخر محسوسات پر ایک غم آلود سی افسردگی اور گہری مغمروگی نے اپنا تسلط جھ

لیا۔ ان لمحوں میں وہ اپنی کیفیات کو پرکھنے سمجھنے سے خود ہی قاصر تھے۔ شاید یہ اس سے

اعتمادی لا چاری اور بے نیسی کا شدید رد عمل تھا جو انہیں رائی کی طرف سے تھملا تھا۔

اندر سے وہ بے یقینی اور کشمکش کا شکار ہو گئے تھے کہ آیا وہ عشق کی یہ بازی جیت

بھی سکیں گے یا.....؟

ایک بہت بڑا اور روح میں شکاف ڈال دینے والا سوالیہ نشان اس موسمِ دھا

برستی بارش میں ان کی نگاہوں کے سامنے لہرانے لگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ رائی کے زور و پینچے تو شوریدہ سرنیدی کی ٹھنڈی و تیز

کے بجائے سمندر کی عمیق گہرائیوں کی طرح ساکت و جاہد تھے۔ حسن اتفاق سے ا

انہیں ڈرائیونگ روم میں اکیلی مل بھی گئی۔

اماں جان موسیقی فلو میں جٹا ہو کر اپنے کمرے میں منہ سر پینے پڑیں تھیں، شرم

ان کا جی بہلاتی باتیں کرتی کرتی ان کے پاس پڑ کر سو گئی تھی۔ ماسی سریاں بنی۔

پاس گئی ہوئی تھیں۔

ان کی گاڑی کو پہچان کر رمضو بابا نے گیٹ کھولا تو وہ گاڑی پورچ میں روک

سیدھے ڈرائیونگ روم میں آئے۔ گویا الہام ہوا ہو کہ گوہر مقصود یہیں دستیاب ہے۔

آواں کی حواہن کے 221

دلاں دیاں رہاں تے پیر اے نیویں گدے
مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ نیویں سکدے
مینوں رب نے بتایا تیرے فنی اوئے
متھے حیرا ناں لکھ کے
بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں کی حواہن کے

پہر غور سنتے سنتے علی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ انھوں نے آج تک توجہ ہی نہ دی
ی۔ مگر اب جو بھنے کی کوشش کرنا چاہی تو گیت کے مفہوم نے ان کے جسم میں ایک
نئی دوزادی۔ انھوں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج اور ابھی جا کر ماں جان (ماں
یاں) سے اس گیت کا پورا مطلب و معنی ضرور معلوم کریں گے۔
گیت کے آخری بولوں نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے اور وہ گھور گھور کر
اُن کا جائزہ لینے لگے۔

اس دفعہ علی نے کوئی تبصرہ نہ کیا نہ اسے ٹوکا بلکہ بہت توجہ اور قوت سماعت صرف
کر کے اس گیت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے اکثر و بیشتر رانی کو ہمارے باشاعری کی آڑ میں بیان کر رہی تھی:

"بازی عشق دی جت لاں گی سوہنیا!
میں رب توں دعا منگ کے
بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے
آواں کی حواہن کے
بوہے باریاں....."

اتفاق سے عین اسی لمحے رانی نے بھی کن انگیوں سے ان کی طرف دیکھا اور فوراً
اُن کی چوری پکڑی گئی۔

آواں کی حواہن کے 220

ان کی چوٹ بخوبی سمجھ میں آگئی تھی۔ مگر اس وقت بے تکلفی کی فضا قائم رکھنے
میں خطرہ تھا۔ جانتی تھی اس بگڑے موسم میں کیوں دوڑے چلے آئے ہیں! اندر ہی اندر
ان کے آنے سے کھسار ہی تھی۔ بے چین ہو گئی تھی۔ مگر بظاہر پرسکون نظر آتا چاہرہ ہی
تھی۔ علی چند لمحے اس کی طرف کے جوابی حملے کے خطرہ رہے۔ پھر مایوس ہو کر خود بھی
شیشے سے ٹک مچے اور باہر دیکھنے لگے۔

دفعہ گانا ختم ہو گیا اور ڈرائیونگ روم کے گہرے سناٹے میں بوندوں کا جلیٹر
سنائی دینے لگا۔ بارش کے پانی کی ٹپاٹپ ہواؤں کی گونج اور بادلوں کی اناہٹ و اناہٹ
ہو گئی۔

رانی نے گھوم کر ریکارڈ دوبارہ لگا دیا۔

وہی حدیثہ کیانی کی آواز اور اس کے پسندیدہ نغمے کے بول:

"بوہے باریاں تے نال کنداں ٹپ کے

آواں کی حواہن کے"

بارہی ریکارڈ سنتے اور سر ڈھنتے دیکھا تھا۔

آج موقع بھی تھا۔ وقت بھی۔

چن جدوں چڑھیا تے لوکی پئے نکدے
ڈونگے پانیاں دے وچ دیوے پئے بلدے
کنڈے لگ جاواں کچا گھڑا بن کے
میں آواں گی ہوا بن کے

ہوں؟“

”اس میں شک بھی کیا ہے!“

رانی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

”بہت خوب!“

علی کا چہرہ چمک گیا۔ جی چاہا اس کم عقل لڑکی کا سر توڑ ڈالیں جو کسی صورت ان کا مدعا سمجھنا چاہ رہی تھی نہ موقع دے رہی تھی

”کوڑھ مغز“

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

”کیوں! کیا یہ“ مفصل جواب“ نہیں ہے؟“

رانی نے بظاہر سادگی سے مگر درحقیقت انھیں جاننے کو دریافت کیا۔

وہ کچھ جھجھک کر بولے۔

”اچھا، میں نے کیا تمہیں استحانی پر چل کرنے کو دے دیا تھا؟“

جواب دینے کے بجائے وہ ان کے جملے کئے انداز پر مسکرائے گی۔

”اب دو نا جواب! چپ کی چادر کیوں اوڑھ لی؟“

انھوں نے سوال کیا۔

”شعر تمہارا لکھا ہوا ہے، وضاحت بھی تھی کرو گی“

”کس چیز کی وضاحت کروں؟“

اس نے سنجیدگی سے نگاہیں اٹھا کر دریافت کیا۔

”یہی جو تم نے لکھا ہے“ علی کاغذ دکھا کر بولے۔

کسی سرنگوں کی ڈالی پہ رکھیں گے چار نیچے

نہ بلند شاخ ہوگی، نہ گرے گا آشیانہ“

امید و بیم کی کیفیت سے دو چار علی کے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں دھڑک رہی تھیں۔

لگیں، مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ذو معنی سی بات کہتے، رانی اپنے مقام سے ہٹ گئی اور گیت بند کر کے خواجہ کیشیں ٹٹو لئے گی۔ کانوں میں رس گھولتی آواز رک گئی تو بارش کی آواز دوبارہ حاوی ہو گئی۔

باہر چھپا جوں میں برس رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے سینے پر بجلی کڑک کر یہاں سے وہاں تک دو دھاری تلواری طرح کوند جاتی تو فضا ایک لمبے کے لیے چکا چوند ہو جاتی۔ شیشوں پر بوندوں کی روانی بڑھ گئی۔ ساتھ ہی علی کے سینے پر بھی دوبارہ منوں بوجھ آ پڑا۔ روشن چہرے والی امید کی کرن گھٹا ٹوپ اندھیروں کی گود میں جا چھپی۔ مایوسیوں، اندیشوں کے کوڑیا لے سانپ چاروں طرف منظر کارنے لگے۔ قوت برداشت کے سینے پر بے مبری رہ رہ کر پنجہ مارنے لگی۔ کچھ گزرنے کا کہہ گزرنے پر اکسانے لگی۔ ٹھو کے پہ ٹھوکا مارنے لگی۔ بالآخر انھوں نے ہار مانا۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

انھوں نے ایک دم ہی جیب سے وہ سفید کاغذ نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔

جھک کر سرگوشی میں پوچھا:

”یہ..... کیا لکھا ہے؟“

رانی اسی مرحلے سے کتراری تھی۔ مگر فیصلہ کن گھڑی بالآخر اپنی تھی جانتی تھی اس رخ اور برستے پانوں میں وہ بلاوجہ تو نہیں آئے!

چند شعر تھے لمبے تیزی سے گزر گئے۔

علی کو اس کی مسلسل خاموشی گراں گزرنے لگی۔

دبے دبے جذباتی لہجے میں خود ہی پہل کر ڈالی

”میں تمہیں“ سرنگوں کی ڈالی“ کے بجائے کوئی بلند وبالا اور تادور درخت نظر

کہ وہ کسی نواب صاحب کی بیوی رہ چکی ہیں۔ اس جوگ سے ان بے چاری کو کیا ملا؟ سوائے دنیا میں ذلیل و خوار ہونے کے اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے! ساری زندگی تباہ و برباد ہو گئی تان کی؟ ان نواب صاحب کا کیا بگڑا؟ وہ تو ان بے چاری کو ایک عدد بیٹی کا تھوڑے کر کہیں روپوش ہو گئے، ادھوری یہ ماں بیٹی رہ گئیں۔

اب ذرا تجربہ کیجئے۔

یہ ایک گورکن کی بیٹی تھیں، اگر کسی اپنے ہی جیسے گورکن یا غریب گھرانے میں بیاہ جاتیں تو کم از کم ایسا تکلیف دہ انجام تو نہ ہوتا! میں تو سمجھتی ہوں دنیا میں بے جوڑ شادی سے زیادہ جیت تاگ اور درد بھرا رشتہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ آپ خود انصاف کیجئے۔ ان نواب صاحب کے بجائے اگر ہماری ماسی مریاں کی شادی اگر اسی گورکن زادے سے ہو جاتی، جسے ماسی مریاں اس وقت اپنی نادانی اور بے وقوفی میں کوئی نمبر دینے کو تیار نہ تھیں، تو زیادہ مناسب نہ ہوتا! کیونکہ میں ممکن ہے وہ آج تک بھی زندہ ہوتا اور ان کا ہم جوڑ ہونے کی وجہ سے یقیناً بیوی بچوں کا سا بنان بنا ہوتا۔ جبکہ اب یہ حال ہے کہ بے چاری کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ہے۔ سارا دن اماں جان سے باتیں کر کر وقت گزارتی ہیں یا پھر کبھی کبھار اپنی بیٹی اور ان کے بچوں سے ملنے کے لیے چلی جاتی تھیں۔ اب کچھ عرصے سے بیٹی نے رہائش کہیں قریب ہی بدل لی ہے اس لیے ذرا جلدی جلدی جانے لگی ہیں۔ آج کل پھر وہیں گئی ہیں بے چاری کا جی بہل جاتا ہے اب تو بہت خوش رہنے لگی ہیں۔“

باہر بادشہ سے جاری تھی۔

بادل رہ رہ کے گرج رہے تھے۔ ہوائیں شور مچا رہی تھیں۔ اندر ڈرائیگ روم کی

اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کل رات والے میرے سوالوں کا یہی جواب ہے تو کتنا بے رحم اور یک طرفہ جواب ہے؟ کیا میری سچائیوں اور حکایت دل کا جواب کچھ زیادہ ہی کڑوا اور سنگد لاندہ نہیں ہے؟“

اس دفعہ رانی نے ان کا طویل سوال بغور سنا۔ دل میں فیصلہ کیا، اب یہ بحث ختم ہونی چاہیے۔ بہت ہو چکا۔

جی کڑا کر کے بالآخر کہہ گزری۔

”جو جواب نواب زادوں کی نظر میں کڑوا اور سنگد لاندہ ہے، وہ ہم بے مائیہ لوگوں کے لیے نہایت مناسب اور محفوظ ترین ہے۔“

علی حیرت زدہ ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ مضطرب لہجے میں پوچھا:

”کیا باور کرانا چاہتی ہو، بھل کر کہو؟“

”سیدھی سادھی سی بات ہے۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں ہیں۔“

وہ نہایت صاف گوئی اور بے رحمی سے کہتی چلی گئی۔

”ہماری ماسی مریاں کہا کرتی ہیں کہ کھواب میں گاڑھے کا پیوند کبھی نہیں چٹا اور چوبارے کی اینٹ چوبارے پر ہی لگتی چاہیے۔ خود ان کی زندگی کی کتنی بڑی مثال ہمارے سامنے ہے، جس سے آپ بھی واقف ہیں۔“

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے علی کی طرف بنور دیکھا۔ واقعی وہ قدرے بے چہم سے دکھائی دیئے۔

وہ انجان بن کر دوبارہ گویا ہوئی:

”اس دن آپ بھی تو بیٹھے تھے جب انھوں نے اپنی داستان حیات سنا شروع کر دی تھی۔ کیسی عبرت انگیز کہانی تھی ان کی! یقین کیجئے میرے روبرو کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی زبانی سننے سے پہلے میں کبھی یقین بھی نہیں کر سکتی“

گئے۔ چہرہ غیر معمولی طور سے سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں گہری ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئے ہوں۔ یا پھر کہتے نہ بن پایا ہو۔ اچانک ہی جھٹکے سے کھوے اور طوفانی انداز میں باہر نکلے چلے گئے۔ رانی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔



فضایں بستہ اور دم بخود تھی۔ رانی کی کلکری آواز اور ٹھہرا ٹھہرا لہجہ علی کے خوابوں پر چڑھ کر یوں کی طرح برس رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے علی بولنا ہی بھول گئے ہوں۔
رانی نے کبھی ان سے اس طرح کھل کر باتیں نہیں کی تھیں۔ زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر وہ بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا رہی تھی۔ علی کی افسردہ نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ دلاویز چہرہ جو اس وقت بہت سنجیدہ اور متین لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر صاف احساس ہو رہا تھا کہ وہ جتنی باشعور اور سمجھدار لڑکی ہے، اس سے کہیں زیادہ گہری اور اپنے حالات سے آگاہ بھی ہے۔
وہ ٹکڑا اس کی صورت کے چارے تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کی زبان سے بے اختیار ایک شعر پھسل پڑا۔

”تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا!“

رانی نے چونک کر شعر سنا۔ مفہوم کو سمجھا اور ایک جی جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ ٹھکی بہ ٹھکی چند اشعار جڑ دیئے۔

گھر ڈوب گیا اور انھیں آواز نہیں دی

حالانکہ میرے سلسلے اُس پار بہت تھے

چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا

دیوار گرانے کو رضا کار بہت تھے

گھر تیرا دکھائی تو دیا دور سے لیکن

رستے تیری ہستی کے پُر اسرار بہت تھے

علی، کچھ غصے، کچھ رنج کے شدید احساسات کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہ

تو وہ ضرور کسی محفوظ مقام پر پناہ گزین ہونے کی کوشش کرتے۔ لیکن اگر اس وقت حواس بحال ہوتے تو وہ جانتے نہ جیتے گھر کے محفوظ دروازے کو خیر باد کہہ کر باہر نکلتے ہی کیوں؟

نظر انداز کئے جانے کا دکھ ان کے دہانے میں زہری طرح اتر گیا تھا۔ وہ رو کر رانی کا بیگانہ لہجہ اور غیریت سے بھرپور رویہ نیزے کی انی کی مانند دل و دماغ میں چھو رہا تھا۔ گڑ رہا تھا۔ ایک ناقابل بیان کلک پیدا کر رہا تھا۔

اس کی باتیں اب تک سماعت سے گرا رہی تھیں۔ اور گرا کر ایک پُر ہول مایوسی اور بے قراری کا سبب بن رہی تھیں۔ وقت اور حالات ایک دردناک عذاب بن کر مسلط ہو گئے تھے۔ جن سے فرار حاصل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔ کئی میل کا فاصلہ اسی صورت اور گھمبیر کیفیت میں طے کرنے کے بعد صورت حال کچھ کچھ تبدیل ہونے لگی۔

انہوں نے محسوس کیا جیسے وہ جوں کی رفتار سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ اس طرح سے تو سفر کتنے کے آثار نہ تھے۔ انہوں نے اپنے آس پاس نگاہیں دوڑانا چاہیں مگر سوائے شفاف شور مچاتے پانی کی چادر کے اور کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا۔

”آف خدا یا!“

وہ ایک ہاتھ سے پیشانی دباتے ہوئے نوبذائے۔

”آج کس مصیبت میں جان پھنس گئی! شاید مجھے کہیں رک کر بارش ٹھہرنے کا انتظار کرنا چاہیے! ہاں یہی مناسب ہے ورنہ تو..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ موسم کے مجڑے مجڑے تو رہ جانے کیا سمجھنا چاہ رہے ہیں“

انہوں نے سوچتے ہی فیصلہ کیا اور فیصلے کے فوراً بعد عمل بھی کر ڈالا۔

بے حد آہستگی سے گاڑی کا رخ تبدیل کیا اور قریب ترین درخت کے نیچے کھڑی

انہیں اپنے بے پناہ غم و غصے اور دلتافت کا اظہار بھی نہ کرنا آیا تھا۔

دل ہی دل میں سارے تاثرات سمیٹے پورچ میں آئے اور مضبوطی سے روکتے روکتے بھی گاڑی باہر نکال لے گئے۔

بہت دیر تک ان کو احساس ہی نہ ہوا پاپا کہ باہر باد و باران کا شدید ترین طوفان آیا ہوا ہے۔ وہ گاڑی سمیت جانا آگے چاہ رہے تھے، طوفان کا ریلنا ان کو اتنی ہی شدت کے ساتھ پیچھے دھکیل دینے کے درپے تھا۔ مگر دونوں ہی شکست قبول کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان کے چاروں اطراف سائیں سائیں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دے رہی تھی۔ سر پھری ہواؤں کی تیزی اور طراری میں بغاوت کے آثار کھل ہو چکے تھے اور یہ ہوائیں زور و شور سے چلتے ہوئے جھکڑوں میں تبدیل ہو کر بلند و بالا درختوں سے جھجڑ جھجڑ کرتے ہوئے خوفناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

چھوٹے چھوٹے کم مصروف روڈ استعمال کرتے ہوئے شاہراہ عام پر آئے تو دور تک سوائے برستے بادلوں کے کوئی ذی روح نظر نہ آتا تھا مگر اس وقت وہ اپنے ہوش میں کب تھے! گیلی سڑک بے حد پھسلنی اور خطرناک ہو گئی تھی۔ عمل ٹھکانے ہوتی

سرخ سرخ آنچ دیتے رخساروں پر چٹکی ہوئی سیاہ بالوں کی لٹیں!
وہ ایک دبا دبا سا سانس لے کر رہ گئے۔

رانی کے پڑھے ہوئے اشعار تو انھیں یاد نہیں تھے، مگر اتنا ضرور یاد رہ گیا تھا کہ وہ کسی فوری، ناقابلِ بیان کیفیت سے بلبلا کر اس کے گھر سے چلے آئے تھے۔ دماغ میں فوراً یہی جھماکا ہوا تھا کہ وہ لڑکی جس کی خاطر انھوں نے اپنی پچھو جانی، پچو پچا صاحب اور بہنوں سے کیسی لمبی لمبی بحثیں کر کے انہیں رام کیا تھا۔ اپنے موقف پر مردانہ وار ڈٹ کر مسلسل اس کی حمایت کی تھی، اور اس کے ہر ناروا سلوک کو بے نقاب کرنا ٹال ٹال دیا تھا، وہ کسی صورت بھی ان کا اعتبار کر لینے کو تیار نہ تھی!

ان کی طرف سے کس قدر بے بھروسہ تھی وہ!
اچانک انھیں اس کے پڑھے ہوئے اشعار کا آخری مصرعہ یاد آئی گیا۔
"رستے تیرے گھر کے بہت بُرے اسرار تھے"

بُرا سرا۔ یعنی اسرار سے بھرے ہوئے!!

علی نے بہت حیرانگی کے عالم میں اپنے آپ سے سوال کیا۔

ان کی اس درجہ بے فروغی کا سبب بھی یہی الفاظ تھا۔ بے پناہ رنج اور دلی صدمے سے ان کی حالت ایک دفعہ پھر بگڑنے لگی۔

میں اسی لمحے بادل بہت خوفناک انداز میں گز گزائے۔

بجلی اس زور سے کڑکی کدول و دماغ تھر تھراٹھے۔ پل بھر کے لیے سماعت جاتی رہی۔ ایک ٹھک ٹھک کڑک سے ہر ذی روح دھل گیا۔

زبردست چکا چوند سے دور دور تک راستے اور نقشے روشن ہو گئے۔ علی کے سے جواں مرد کا دل سینے میں کانپ گیا۔ انھوں نے بے اختیار کلمہ پڑھتے ہوئے ہاتھ

کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک دم ہی قدرے امن اور سکون کا احساس ہوا۔
اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انھوں نے انجمن بند کر دیا۔ لمحہ بھر کے لیے سنانے کا احساس ہوا لیکن جلد ہی طوفان کی زنائے دار آوازوں میں کہیں جا کھویا۔
آج سکون ان کے مقدر سے ناپید ہو چکا تھا۔ کیونکہ جلد ہی ان کی کرشمہ ساز چٹھی جس بیدار ہو گئی اور وہ ایک دفعہ پھر شدید اضطراب کا شکار ہو گئے اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"اف!!"

وہ ایک دکھی سانس بھر کر رہ گئے۔ سینے میں درد و گداز کا ٹھانٹھا مارتا سمندر اٹھنے لگا۔

آج مقدر پھر انہیں اسی برآمد کے بلند و بالا اور یادگار درخت کے نیچے کھینچ لایا تھا۔ جس کے قریب سے بھی گزرتے ہوئے ہمیشہ رانی کا خیال حاوی ہو جاتا رہا تھا اتفاق سے اس وقت کسی دوسری سواری نے یہاں پناہ نہیں لی تھی۔ علی اور ان کی گاڑی کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا۔ لہذا رانی اور رانی سے وابستہ ہر گمان، ہر خیال اور ہر بات کا رنگ گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ وہ زمان و مکان کی حدود سے نکل کر کہیں سے کہیں جا کھوئے۔ وہ کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ ایسا ہر سوال تشنہ ہی رہ گیا۔ کچھ دیر قبل کی واردات اور رانی کا رویہ اور باتیں دل و دماغ اس حد تک تازہ اور ناگٹ بھری ہوئی تھیں کہ وہ اپنے گرد و پیش سے قطعی غافل ہو گئے۔

اسی جگہ اور اسی برآمد کے پرانے چڑ کے نیچے طوفانی موسم کی اس دل پر نقش ہو جانے والی واردات سے لے کر آج تک کے تمام واقعات بہت سلسلہ وار روح کے سر بند کواڑ کھول کر یکے بعد دیگرے وار دہور رہے تھے۔

کانوں پر رکھ لیے اور سر سنمیرنگ پر.....

تجھی وہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکے۔

بلند و بالا برگد کا ایک تناور اور بھاری بھر کم ٹہنا بہت بلندی سے ٹوٹا اور ایک

قیامت خیز رفتار اور آواز کے ساتھ ان کی گاڑی پر آن گرا۔



اگلے دن چھٹی کا دن تھا۔

ایسا دن کہ اگر رمضان المبارک نہ ہوتے تو بہت مصروف دن ہوتا۔ لیکن روزہ ہونے کی وجہ سے کم از کم صبح سے دوپہر تک کوئی کام اور مصروفیت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ سحری کے بعد فجر ادا کرو، تلاوت کلام سے فارغ ہو کر لمبی تان کر سو رہو۔

ایسے میں جب کہ ماسی مریاں بھی غیر حاضر ہوئیں تو لڑکیوں سے پہلے اماں ہی اٹھیں کیونکہ جھاڑو پونچھا کرنے والی آجاتی تو ایک دو کام مزید نکل آتے۔ رانی اور شرمین کے اٹھنے سے پہلے اماں شام کے لیے رمضو بابا سے سودا سلف بھی گوا لیتیں۔

آواں گی موائیں کےO..... 235

جس ٹیش کے عالم میں روانہ ہوئے تھے، رانی کو اس کا بہر حال پورا ادراک بھی
..... احساس بھی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

غور سے دیکھا۔ اخبارات واقعی کل کی قدرتی آفات کی خبروں سے بھرے
ہے تھے۔ ادارے چیخ اٹھے تھے۔ دردناک اور روٹکھٹے کھڑے کر ڈالنے والی تصاویر
نہ دل ہلا ڈالا۔

شہر کے مضافات میں کئی مقامات پر آسانی بجلی گرنے کے واقعات ہوئے
ہے۔ بلند و بالا درخت جڑوں سے اکھڑے پڑے تھے۔ پختہ سڑکوں پر بھی پانی ہی پانی
عائی دے رہا تھا۔

وہ چھلانگ مار کے بستر سے نکل بھاگی۔

ٹیلی فون کی لائینیں معلوم نہیں رات کے کس پہرے جان ہو چکی تھیں۔ اس نے
مدی جلدی جزیئر اسٹارٹ کر لیا۔ کانپتے ہاتھوں سے ٹی۔ وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ اور
بے دل پسلیاں تو ذکر ٹکٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

ٹی۔ وی خبر نامے میں ہر طرف سکتے ہوئے مناظر تھے۔ بڑپتے ہوئے لاشے
نہ۔ جناحی اور برہادی کی داستانیں تھیں۔

”الٹی سب کی خیر ہو“

اماں جان نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر سب کے لیے دعا کی۔

ند چاہتے ہوئے بھی عادت کے مطابق اس کی زبان سے پھسل پڑا۔

”آپ نے دیکھا نہیں اماں کہ ستم کچی آبادیوں پر ٹوٹے ہیں۔“ اوپنی

ادایاں ”سب خیریت سے ہیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔“

آواں گی موائیں کےO..... 234

کل کے طوفانِ باد و باران نے اک تہلکہ مچا ڈالا تھا۔

باہر سے رمضو پایا آئے تو یہی کہانیاں لیے ہوئے۔

کام والی بچی تو ایسی ہی خبروں کے ساتھ۔

شہر بھر کا مواصلاتی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ بجلی اور ٹیلی فون کے کھپے
زمین بوس ہو گئے تھے۔ سیکڑوں درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے۔ لٹھی علاقے
گھٹنوں گھٹنوں پانیوں میں ڈوب گئے تھے۔ کچی آبادیوں میں جانی اور مالی
نقصان زیادہ ہوا تھا۔ پانی کے ذخائر کی اور گرد والی بستیاں زیرِ آب
تھیں۔ معلوم نہیں کتنے گھر گر چکے تھے۔ کتنے لوگ مال مویشیوں سمیت بہہ گئے
تھے۔ کتنے بے گھر ہو گئے تھے اور کتنے مر چکے تھے۔ اک کھرام کا سماں تھا، ج
چہار عالم میں پھیل گیا۔

شہر کا بیشتر علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

آسمان آج بھی بادلوں سے ڈھکا ڈھکا تھا مگر کل والی کیفیت تھی اور نہ کل کی تباہی
وہ بادی کے آثار۔

بہت بڑے بڑے المناک واقعات کے بعد زمین و آسمان سکون پزیر ہو چکا
تھا۔ بس اب نقصان گزیدہ اپنے زخموں کی ٹیمیں سہہ رہے تھے۔

اسپتال زخموں اور مرنے والوں سے بھر گئے تھے۔

ہا کر اخبار ڈال گیا تو اماں جان سرخیاں پڑھ کر دل گئیں۔ مارے ہول
انہوں نے چیخ چلا کر لڑکیوں کو جگا ڈالا۔

صورۃ حال واضح ہوئی تو رانی کو سب سے پہلا خیال علی کا ہی آیا۔ یہاں۔

آواں کی حوا بن کے O 237

سارا دن وہ جلے پیر کی پٹی کی طرح بے چین کھومتی رہی۔

آج خلاق معلوم اس نے روزہ افطار کے لیے بھی کوئی اہتمام نہ کیا۔ ظہر کی نماز کے لیے جاؤ نماز پر کھڑی ہوئی تو جانے کیوں دل بھر بھر آیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے،

سن پھیلا یا تو زندگی میں شاید پہلی بار وہ جی کھول کے روئی۔

”یا اللہ! میں کیا چاہتی ہوں؟ شاید مجھے نہیں معلوم۔“

میری مدد فرما۔ میرا رہنما بن جا میرے خدا.....“

اب تک اس کی دعا میں رہا تھا نہ سوچوں میں!

جب وہ جاؤ نماز لپیٹ رہی تھی تو اس نے غور کیا۔

شرمین نے اس کا پسندیدہ نقد لگا رکھا تھا۔ حدیقہ آخری بول گاری تھی۔

”بازی..... عشق دی جت لوں گی سوہنیا،

میں رب توں دعا منگ کے،

بوہے باریاں.....“

بوہے باریاں تے نال کنڈاں ٹپ کے،

میں آواں گی حوا بن کے “

وہ سر جھٹک کر کچن میں جا گئی۔ مگر آج کی تاریخ میں اقرار نا پید

ایسی نادان تو نہ تھی کہ اپنا موقف نہ سمجھ پاتی! اس نے گھنٹوں اپنے اور علی

میں متعلق ہر زاویے سے موازنہ اور تجزیہ کیا تھا، یہ ضرور ہے کہ علی کی شخصیت

ان کے پورے کنبے میں اسے کوئی جھول اور کھوٹ باوجود تلاش بسیار کے

نہ آیا۔ اپنے انکار اور کھٹکس کا راز اس کے سوا دکھائی نہ دیتا کہ اس

آواں کی حوا بن کے O 236

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

اماں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

اس نے لا پرواہی اور بے نیازی برتنی چاہی۔

”میرا مطلب ہے..... ابو جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ بڑے لوگوں

قریب سے مصیبتیں بھی پہلو کتر اگر گزر جاتی ہیں۔“

”لا حول ولا قوتہ!“

اماں جان بچھے سے اکڑ گئیں۔

”ہم پوچھتے ہیں تمہاری کھوپڑی کا خناس کیا کر کے دم لے گا؟“

انھوں نے رانی کو بری طرح لٹا ڈالا۔

”خدا کے خوف سے ڈرو بیٹی۔ ہر وقت کے وہم و گمان اور بڑے بول اچھے

ہوتے۔ تم ایک باشعور لڑکی ہو۔ اپنی سوچوں اور خیالات کو بدلو۔ سب کو ایک ہی نگاہ

سے مت دیکھا کرو۔ نہ ایک جیسی عینک سے دیکھو۔“

رانی شرمندہ ہو گئی۔

شرمین بڑبڑاتی ہوئی اپنی گڑبوں کے کپڑے الٹ پلٹ رہی تھی۔

”ایک تو یہ ماسی سریاں ہر روز ہی مہمان بن بن کر جانے لگیں۔ معلوم نہیں

اتنا اپنی بیٹی کے پاس کیوں جانے لگی ہیں۔ میری ساری گڑبوں کے سارے

پھٹ گئے ہیں مگر انہیں فرصت نہیں ہے.....“

رانی اس کی بڑبڑاہٹ سن کر اٹھ گئی۔ مگر غل نہ دیا۔ طبیعت بہت اچاٹ ہو رہی

تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگ رہا تھا۔

تھے۔ ایسا منظر کسی نے آج تک یہاں کے ماحول میں نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ کالج سے
"قصر دیدار" تک ایک سو گوار نضاء کا تسلسل تھا۔
رانی کا دم بٹا ہو گیا۔

کل سے اب تک کے تمام خدشے پورے ہو گئے تھے۔ سب سے غیر حالت
میں وہ بھی "قصر دیدار" پہنچی تو اسے ہاتھوں ہاتھ کسی ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا
جہاں اس وقت کالج کی کوئی ساتھی موجود نہ تھی مگر اپنی لرزاں لرزاں کیفیت میں وہ سمجھ
نہ پائی۔

سب سے پہلی نظر علی پر جم کر رہ گئی۔ بہت ساری بیٹیوں میں جکڑے براہ راست
اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رانی کی آنکھیں پر نالہ بن گئیں۔ تبھی کوئی ہلک کر اس
سے چٹ گیا۔ شہزادی تمباکو کا تیز بھبھکا دماغ سے نکرایا۔

"اللہ خوش رکھے..... میری بچی آگئی"

رانی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ ماسی مریاں بہترین پوشاک زیب تن کئے
اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ان کی کلائیوں میں کھنا کھن بجتے ہوئے نگلن رانی کے منجھے
تو رانی کو ہوش آیا۔

اس نے بوکھلا کر علی کی طرف دیکھا۔ جہازی سائز بیڈ پر لیٹے سفید پٹی کی اوٹ
سے بھی ان کے بھرے بھرے ہونٹ شرارتی انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے عقب
میں فیروز جہاں، شاہ جہاں، شاد جہاں اور اس کے بچے کھڑے ہنس رہے تھے تبھی علی
کے نکتے پر رکھائپ بچتے لگا۔

دلاں دیاں راہاں تے پھرے عیوں گلے

کے اندر کہیں ایک خوف اضطراب، ڈر اور وہم ہمیشہ کے لیے نیچے کا ڈکر
گیا تھا۔

وہ دل ہی میں خود کو ڈرانے کی کوشش میں مصروف رہتی۔
"خبردار رانی!"

ماسی مریاں سے بھی بدتر حالات کا شکار ہو جاؤ گی!
بھول کر بھی اپنا مستقبل نواب فیملی سے وابستہ نہ کر بیٹھنا۔ شاد بیگم کی
ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دی جاؤ گی۔ اپنا مطلب نکل جانے یہ بڑے لوگ طو۔
طرح نکالیں پھیرنے میں دیر نہیں لگاتے۔

خود ابو جان نے بھی تو اماں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا! اور پھر..... اسی نواب نے
ماسی مریاں کو کیا دیا؟

لاکھ نواب صاحب کا انتقال ہو گیا مگر علی نے ان بے چاری کو کوئی رسپیڈ
اپوری کہانی سن کر بھی خاموشی اختیار کر لی۔

کبھی میرے سامنے تک یہ تذکرہ نہ لائے..... اف تو بہ"

اتوار کا سارا دن اسی کشمکش اور اضطراب میں کٹ گیا۔

اگلے روز وہ حسب معمول کالج پہنچی تب گویا بھونچال سا آگیا۔

پورے کالج کی طالبات ٹولیوں میں بٹ بٹ کر "قصر دیدار" کا رخ
تھیں۔ سب کے چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ ہر طرف ہلکی ہلکی سرگوش
بھبھناہٹ تھی۔

کیا اساتذہ، کیا طالبات اور کیا اُردلی، چہر اسی سب دعاء خیر میں

آواں کی حواہن کے O 240

مقدراں دے لکھے ہوئے مٹ نہیں سکتے

میں نوں رب نے بنایا تیرے لئے اوئے،

مُتھے تیراں لکھ کے

ہو ہے باریاں

آواں کی حواہن کے

اختتام